حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری

نقشبندی، مجددی، توحیدی

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

پیش لفظ

انسان نے جب عقل وشعور سے کام لے کر اپنے گردوپیش کی کائنات اوراس میں واقع ہونے والے تغیرات اور مظاہر فطرت پر غور وفکر کرنا شروع کیا تو گویا اس کے علمی سفر کی ابتدا ہو گئی ۔ وہ ہر "کیا، کیوں اور کیسے" کا جواب ڈھونڈنے کیلئے قدم بقدم آگے بڑھنے لگا۔ اس طرح وہ عقل خداداد کے بل بوتے پر لاتعداد مادی اشیاء کی حقیقت معلوم کر کے انہیں اپنی خدمت میں لگائے چلا جارہا ہے۔

فطرت کی کئی ایک طاقتیں ایسی بھی ہیں جن کی اصل حقیقت اورماہیت کو تو وہ نہیں جان سکا لیکن تجربات کی مدد سے ان کے بہت سے خواص کا علم حاصل کرلیا۔اس طرح اُس نے بجلی، مقناطیسیت، کشش ثقل، ایتھر اور کاسمک شعاؤں کو استعمال کر کے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔اور اللہ ہی جانتا ہے کہ انسانی تسخیر وتعمیر کا یہ انداز مستقبل میں اسے کہاں تک پہنچا دے گا۔

انسانی عقل کی ان عظیم الشان کامرانیوں کے باوجود اس کی کم علمی کی مثال ایسی ہے کہ گویا علم کے وسیع سمندر سے وہ ایک قطرہ ہی حاصل کر پایا ہے۔اور حقیقی عالم وعارف اسی کو کہتے ہیں جو اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے کہ جو کچھ وہ جان چکا ہے اس کے مقابلے میں جو وہ نہیں جان سکا وہ بہت ہی زیادہ ہے ۔اس سے معلوم ہوا کہ انسانی عقل تو ابھی تک مادہ کی بھول بھلیوں ہی سے باہر نہیں نکل پائی ۔ابھی تک یہ بھی فیصلہ نہیں ہو سکا کہ مادے کی حقیقت کیا ہے اور اس کی تخلیق کیونکر ہوئی ؟ اور بے عقل اور بے شعور مادے سے باشعور زندگی نے کیسے جنم لیا؟ انسان خود کیا ہے؟ وہ کہاں سے آیا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور اسے زمین پر کس غرض سے بھیجا گیا ہے؟انسانی ذہن کیا چیز ہے؟ انسانی دماغ اور جسم پر

حکمران اورانہیں ایک آلے کی طرح استعمال کرنے والی "میں، **آنا یا ایغو**" کیا ہے ؟انسانی شخصیت کی اصل حقیقت کا وجود مادی ہے یا غیر مادی؟ اگر غیر مادی ہے تو اس کا ذہن اور دماغ کے ساتھ تعلق اور رابطہ کس نوعیت کا ہے اور اس کی اپنی قوت کا سر چشمہ کہاں ہے؟ الغرض اسی قبیل کے لاینحل سوالات اور نا قابل تشریح حیرت انگیز واقعات کی طویل فہرست موجود ہے جن کے سامنے عقل اور سائنس مُہر بلب ہیں۔ جب مادی اور معلوم اشیاء کے فہم میں عقل وخرد کی بے بسی کا یہ عالم ہے تو وہ مادہ کے ماوراء وسیع وعریض روحانی عالم کی حقیقت شناسائی کا دعویٰ کیونکر کر سکتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے خوب فرمایا ہے!

خرد سے راہ روروشن بصر ہے
خرد کیا ہے ؟ چراغ رہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

لیکن ان حدود وقیود کے باوجود بھی انسان "اللہ، انسان اور کائنات" کے تکوینی معمہ کو حل کرنے کیلئے عقل کے گھوڑے دوڑانے میں لگا رہا تا کہ ان تینوں کی حقیقت کے ساتھ ان کے باہمی تعلق کی نوعیت کو بھی جان سکے۔ چنانچہ بڑے بڑے دانشور، فلاسفر اور مفکرین اپنی اپنی سمجھ اور ہمت کے مطابق اس گتھی کو سلجھانے میں ذہنی توانائیاں لگا کر نظریات قائم کرتے رہے جو وقتی طور پر کچھ لوگوں کی تسکین کا باعث بنے لیکن انہیں قبولیت عام کا شرف کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ اِس لئے ان سے اختلاف بھی کیا جاتا رہا اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں۔

اہل خرد کے برعکس اللہ تعالیٰ کی اپنے انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اتاری ہوئی وحی کی تعلیم پر ایمان رکھنے والے بلند ہمت اہل ذوق نے تصوف یعنی عشق ووجدان کے ذریعے

حقیقت کی نقاب کشائی کی کوشش کی۔ اُنھوں نے تزکیہء نفس اور تصفیہء قلب کا راستہ اپنایا تا کہ دل کی آنکھ یا باطنی بصیرت کے ذریعے حقیقت کبریٰ کا مشاہدہ کر سکیں۔

سلوک یعنی رُوح کے اِس سفر میں کئی مقامات ایسے آتے ہیں جنھیں سالک صحیح طور پہ سمجھ نہیں پاتا اور غلط فہمی کے سبب کسی مقام کو آخری منزل جان کر وہاں ہی اپنا رختِ سفر کھول دیتا ہے۔ روحانی عالم میں بہت آگے ھُو کے مقام پر وحدت الوجود کی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کی دلفریب کیفیات نے بڑے بڑے بزرگوں کے قدم ایسے روکے کہ وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن جو سالک راستے میں نہیں رُکتے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے عرش تک پہنچ جاتے ہیں صرف اُنھیں ہی ذات بحت کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اور وہی عارفِ کامل اور ولی مکمل کہلاتے ہیں۔ لیکن یہ عظیم سعادت لاکھوں سالکوں میں سے ایک دو ہی کو نصیب ہوتی ہے باقی سب اللہ والے اپنے اپنے مقام محمود پہ پہنچ کر رُک جاتے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف اور سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے بانی حضرت قبلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ ایسے ہی منفرد اور بلند پایا صوفی ہیں جنھوں نے مکمل سلوک طے کیا اور رویت باری تعالیٰ کی نعمت سے مشرف ہوئے۔ اِس لئے وہ نہ صرف آشنائے راہ ہیں بلکہ حقیقت شناس اور محرم راز بھی ہیں۔ اِس لئے مختصر سی کتاب میں وحدت الوجود جیسے نازک اور متنازعہ مسئلہ پہ جس اچھوتے انداز اور عام فہم الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے وہ آپ ہی کا استحقاق ہے۔ اس کے مطالعہ سے جہاں ایک عام قاری کو اس معروف لیکن مشکل مسئلہ کے بارے میں خیال افروز معلومات حاصل ہوں گی وہاں طالبانِ حق کو راہِ سلوک کی اُن کیفیات اور مقامات سے بھی آگاہی ہو جائے گی جہاں منزلِ عرش کے کئی مسافر غلط فہمی کی وجہ سے کسی کیفیت کو حقیقت سمجھ کر وہیں رُک گئے اور ذاتِ بحت تک سلوک طے نہ کر سکے۔

محمد صدیق ڈار توحیدی

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

۱

ابتدائیہ

دُنیائے اسلام کے زوال کی بڑی بڑی وجوہات میں سے ایک بہت بڑی وجہ فقہی مسائل میں ائمہءِ فقہ کا باہمی اختلاف بھی ہے۔ اگرچہ اِن ائمۃ اربعہ نے فقہی مسائل کا فیصلہ قرآن اور احادیث کی روشنی میں اپنی اپنی عقل اور علم کے مطابق کیا تھا اور جتنے بھی اختلافات تھے سب فروعی تھے، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا عوام کسی ایک امام کی تقلید میں پختہ تر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ساری ملت حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی چار فرقوں میں تقسیم ہو گئی اور آگے چل کر یہ اختلافات اِس قدر شدید ہو گئے کہ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو ناری سمجھنے لگا۔ مرورِ ایام سے ان فرقوں میں اور شاخیں نکل آئیں اور تعداد روائتی بہتر فرقوں سے بھی کہیں زیادہ ہو گئی۔ اِن میں سے بہت سے فرقے تو ختم ہو گئے اور بہت سے اب بھی باقی ہیں۔ تماشہ کی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ یہ اختلافات بالکل فروعی اور بہت معمولی ہیں لیکن آپس کی مغائرت بلکہ منافرت اِس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ایک فرقہ کا آدمی دوسرے فرقے والوں سے بات کرنا بلکہ اِن کی مساجد میں نماز تک پڑھنا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اکثر مسجدوں کے دروازوں پر کتبے لگے ہوئے ہیں کہ یہ مسجد احناف ہے، یہ مسجد اہل حدیث ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی مصیبت کا مارا غلطی سے کسی دوسرے فرقے کی مسجد میں چلا جائے۔ تو پٹائی تو شاید نہ ہو لیکن شرمندہ اور ذلیل ہو کر وہاں سے نکلنا ضرور پڑتا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ اِن مسجدوں کو مساجدِ ضرار نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ رونا تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں اِس عناد و فساد اور تفریق و تخریب کا باعث علمائے دین کی وہ جماعت ہوئی اور اب بھی ہے، جس کا کام، پیشہ بلکہ فرضِ منصبی ہی مسلمانوں کو متحد کرنا، متحد رکھنا اور صراطِ مستقیم پر چلانا تھا جس کو حضور نبی کریم ﷺ نے اپنا وارث ٹھہرایا اور خدا نے جس کی بابت فرمایا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ يَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ٥

(ترجمہ) ''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے، (اوامر کا حکم دے اور نواہی سے روکے)''۔

مگر افسوس اِس جماعت نے اپنا فرض ادا نہ کیا اور اُمت مسلمہ پارہ پارہ ہو کر رہ گئی ۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

اِدھر تو یہ علمائے دین تھے دوسری طرف اِن کے برخلاف صوفیائے کرام کی جماعت تھی جن میں بہتّر سے بھی کہیں زیادہ سلسلے اور خانوادے موجود تھے اور ہر سلسلہ میں ذکر و فکر، ریاضت و مجاہدہ اور تزکیہ اخلاق و تصفیہ قلب کے طریقے ایک دوسرے سے کافی مختلف تھے لیکن ان میں نہ کوئی عناد و فساد تھا نہ تفریق و تخریب۔ سب آپس میں بھائیوں کی طرح رہتے اور ایک دوسرے سے دِلی محبت کرتے تھے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ ''دو پادشاہ در یک اقلیم نہ گنجند و دہ درویش در یک گلیم بخسپند''۔ لیکن یہ حالت چھٹی صدی ہجری کے آخر تک رہی۔ اِس کے بعد تصوف اسلامی میں ایک ایسا عقیدہ ظہور پذیر ہوا جس نے صوفی حضرات کو بھی دو جماعتوں میں بانٹ دیا۔ اِس عقیدے کو وحدت الوجود کہتے ہیں۔ تصوف کو اس عقیدے سے جناب ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے متعارف کرایا تھا۔ حضرت ابن عربیؒ اپنے وقت کے یگانہ روزگار بزرگ تھے۔ وہ ۲۹ جولائی ۱۱۶۵ء مطابق ۵۶۰ھ میں اُندلس کے شہر مُرسیہَ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر میں مُرسیہَ سے اشبیلیہ چلے گئے۔ وہاں ۳۷، ۳۸ برس کی عمر تک رہنے اور اکتساب علوم کے بعد مشرقی ممالک کی سیاحت کیلئے چل دیئے۔ مصر و عراق، شام اور دوسرے ممالک کی سیاحت کے بعد مکہ معظّمہ پہنچے۔ وہاں عرصہ تک قیام کرنے کے بعد ''فتوحات مکیہ'' لکھی۔ وہاں سے پھر اپنے وطن کی طرف مراجعت کی لیکن وطن نہ پہنچے بلکہ راستے ہی سے پھر واپس دوسرے ملکوں کی سیر کرتے ہوئے مصر آئے۔ اِس وقت تک

آپ کی کتاب فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم بہت مشہور ہو چکی تھیں اور اِس زمانہ کے علمائے دین اور صوفیائے کرام کے زیرِ نظر تھیں۔

چونکہ انہی کتابوں میں آپ نے وحدت الوجود کا مسئلہ تحریر فرمایا تھا اور وہ قرآن کی تعلیم سے ٹکراتا تھا۔ اِس لئے بہت سے علمائے دین مخالف ہو گئے چنانچہ یہ جب مصر پہنچے تو علمائے کرام نے ان کے کفر کا فتویٰ دیا۔ اور سلطان مصر نے اِن کے قتل کا حکم دے دیا۔ یہ بات ان کو بھی معلوم ہو گئی۔ وہ چپکے سے مصر سے نکل کر دمشق پہنچ گئے۔ باقی عمر وہیں درس و تدریس اور وعظ و نصیحت میں گذاری۔ آخر ۱۲۴۰ء مطابق ۶۳۸ھ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

حضرت ابن عربیؒ بہت عظیم المرتبت عالم، ولی کامل اور چوٹی کے عارف باللہ تھے اور اِس زمانہ کے علوم متداولہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے بہت بڑے مفکر اور فلاسفر بھی تھے۔ تخلیق کائنات پر از روئے فلسفہ خوب غور و فکر کرنے کے بعد سلوک طے کیا اور فلسفہ و تصوف دونوں کے لحاظ سے اِس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ ساری کائنات ایک وجود ہے اور یہی خدا ہے اور اِس میں جو کثرت نظر آتی ہے یعنی جو لاکھوں اشیاء ظاہر ہوتی اور پھر اسی میں غائب ہو جاتی ہیں یہ سب اِسی ایک وجود کی مختلف شانیں یا تجلیات ہیں اور یہ سب اِسی وجود کا عین ہیں یعنی خدا ہیں۔ اِس بات کو جناب ابن عربیؒ نے بڑی شدومد سے بیان اور ثابت کیا ہے اور اصرار کیا ہے کہ یہی حقیقت ہے۔ انہوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ یہ جو کچھ لکھا ہے اپنے مشاہدہ رُوحانی کی بناء پر لکھا ہے۔

اب اگر ان کے اِس دعویٰ پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے خدا ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ یونہی رہے گا۔ گویا مخلوق کا تو کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات قرآن کی آیات بیّنات کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن میں تو اللہ تعالیٰ نے بیسیوں جگہ یہ فرمایا ہے کہ میں خالق ہوں اور میرے سوا جو کچھ بھی موجود ہے وہ سب مخلوق ہے اور میں نے ہی اِسے پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے دین نے اِن کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا۔ اب ایک طرف تو ان کا یہ دعویٰ ہے اور دوسری طرف ان کا ورع و تقویٰ،

شریعت وسنت کی پابندی اور اِن کی ذات سے کرامات کا ظہور متقاضی تھا کہ اِن کو ولی اللہ تسلیم کیا جائے چنانچہ علمائے دین اور صوفیائے کرام میں دو جماعتیں پیدا ہو گئیں ایک اُن کی تکفیر کرتی اور دوسری ان کو ولی کامل مانتی تھی یہ صورت آج تک باقی ہے۔

جناب ابنِ عربیؒ نے اپنی کتاب کے شروع میں ہی لکھ دیا ہے کہ "جو شخص میری کتاب میں دی ہوئی اِصطلاحات اور منازل و مقامات سے واقف نہ ہو وہ ہرگز اِس کتاب کو نہ پڑھے ورنہ ایمان خراب ہونے کا خطرہ ہے"۔ لیکن ایسا لکھ دینے سے کیا ہوتا ہے۔ عوام کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ لوگوں نے کم علمی کی وجہ سے اُن کی کتابوں کو نہیں تو ان کتابوں کی تشریحات جو دوسروں نے کی تھیں اُن کو خوب مزے لے لے کر پڑھا اور بزعم خود سمجھ لیا کہ ہم نے حقیقت کو پالیا ہے یعنی یہ کہ جو کچھ موجود ہے یہی خدا ہے اور اِس کے علاوہ خدا اور کوئی نہیں۔ مطلب یہ کہ ہم بھی خدا ہیں۔ نعوذ باللہ۔

لطیفہ | میرے ایک دوست جو فلسفہ کے ایم اے تھے ایک دن مجھ سے وحدت الوجود پر گفتگو کر رہے تھے جب میں نے ان کو ہر طرف سے لا جواب کر دیا تو کہنے لگے کہ "جو کچھ بھی ہو مجھ کو تو اگر ایک سیکنڈ کیلئے بھی یقین آ جائے کہ میں خدا نہیں ہوں تو میں فوراً مر جاؤں"۔ میں نے جواباً کہا کہ سبحان اللہ آپ بڑے اچھے خدا ہیں کہ آپ کو موت بھی آ سکتی ہے۔

حضرت ابن عربیؒ کے موافق اور مخالف لکھنے والے سینکڑوں ہی تھے لیکن خلاف لکھنے والوں میں امام ابن تیمیہؒ اور امام ذہبی دو بزرگ ایسے تھے جن کی تحریریں آج بھی بطور سند پیش کی جاتی ہیں لیکن ابن عربیؒ کے قلم اور طرز نگارش و استدلال میں وہ زور تھا کہ اِس کے آگے کسی کی پیش نہ گئی اور نظریہ وحدت الوجود کو رفتہ رفتہ تمام اسلامی ممالک کے بہت سے علماء اور شیوخ نے بہ حیثیت ایک عقیدے کے قبول کر لیا۔ یہاں تک تو خیریت تھی لیکن علماء اور شیوخ سے نکل کر بات جب جاہل صوفیوں اور ان کے مریدوں تک پہنچی تو ایک طوفان بپا ہو گیا۔ جو لوگ پہلے ہی سے شریعت کی پابندیوں اور حدود و قیود سے گریزاں تھے ان کے تو مزے آ گئے۔ نماز نہ روزہ، حج نہ

زکوۃ، خیر نہ شر جو جس کا دل چاہتا کر گزرتا۔

دوڈھائی سو برس یہی طوفان برپا رہا کوئی پوچھنے اور ٹوکنے والا نہ تھا۔ حقیقتاً ان جہلا میں سے ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ میں خدا ہوں اِس لئے اعمال کی تمام حدود و قیود سے مطلقاً آزاد ہوں جو چاہوں سو کروں خدا کیلئے عذاب وثواب چہ معنی۔ علمائے ظاہر اگر کبھی روکتے ٹوکتے بھی تو اُن کا مذاق اُڑایا جاتا اور اُن کو برا بھلا بھی کہا جاتا۔ مرے پر سو دُرے۔ زمانہ چلتے چلتے مغل بادشاہ اکبر کے عہد تک پہنچ گیا۔ یہ بادشاہ صرف نام کا مسلمان اور ابوالفضل وفیضی جیسے "ہمہ اوستیوں" کا ذہنی غلام تھا اِس کی حکمتِ عملی ہی یہ تھی کہ رعایا کی اکثریت یعنی ہندوؤں کو خوش رکھا جائے خواہ اسلام کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ہر طرح دِل شکنی اور ہندوؤں کی ہر طرح ہمت افزائی کی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ جزیہ موقوف اور ذبیحہ گاؤ حکماً بند کر دیا گیا تھا اور اگر کوئی گائے ذبح کر لیتا تو اِس کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ بادشاہ کے گرد ایسے لوگ اکٹھے ہوگئے تھے جو وحی اور شریعت کے منکر تھے۔ بادشاہ خود علی الاعلان اسلام کی مخالفت کرتا اور احکامِ شرع کو احمقانہ بتاتا تھا۔ محلوں میں نماز اور اذان بند کر دی گئی تھی۔ کئی مسجدیں توڑ کر مندر بنا دی گئی تھیں۔ گائے کا گوشت حرام اور سؤر کا گوشت حلال قرار دیا گیا تھا۔ کتے اور سُؤر مظہرِ الٰہی سمجھے جاتے تھے۔ بادشاہ کے سامنے احمدؐ، محمدؐ اور مصطفیٰؐ جیسے نام لینا جرم تھا۔ استغفر اللہ۔ اُس وقت کے مفصل حالات کے لئے "منتخب التواریخ" پڑھنی چاہیئے اِس چھوٹے سے رسالہ میں اِس سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اکبر نے ویدوں اور اپانشدوں کا ترجمہ سنسکرت سے فارسی میں کرایا۔ ان میں وحدت الوجود پہلے ہی سے موجود تھا اب کیا تھا گھر گھر وحدت الوجود کا ڈنکا بجنے لگا۔ جو کوئی اِس کے خلاف آواز اُٹھاتا گردن زدنی قرار پاتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اگر سارے ہندوستان میں نہیں تو کم از کم دربارِ اکبری اور اِس کے زیرِ اثر حلقوں میں تو اسلام عملاً ختم ہو گیا تھا اور جہاں باقی تھا جانکنی میں مبتلا تھا۔ الغرض بے دینی اور الحاد انتہا تک پہنچ چکا تھا کہ اکبر کا انتقال ہو گیا اور جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا۔

جہانگیر نے ہندو ماں کی گود میں آنکھ کھولی۔ جن حالات میں ہوش سنبھالا اور جس ماحول میں پرورش پائی اُس کے پیشِ نظر ہم اُس کے مذہبی خیالات اور دینی عقائد کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ الحاد و لادینیت جو اِس کو باپ سے ورثہ میں ملی تھی ویسے ہی جاری تھی بلکہ اِس میں اور ترقی ہو رہی تھی کہ ایک دن چند مصاحبوں نے اُسے بتایا کہ ایک شخص جس کا نام شیخ احمد ہے اور جو اپنے آپ کو مجدّدِ وقت بھی کہتا ہے سرہند سے اِس شہر میں وارد ہوا ہے وہ کہتا ہے کہ ''اے لوگو تم اور تمہارا بادشاہ سب کفر و ضلال میں مبتلا ہیں اور سیدھے دوزخ کی طرف جا رہے ہیں۔ اے لوگو! جلدی واپس لوٹو۔ ان اقوال و اعمال مشرکانہ سے توبہ کرو اور قرآن کے دامن میں پناہ لو۔ ورنہ عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو گے اور جس طرح پہلی گمراہ قومیں تباہ ہو گئیں تم بھی تباہ ہو جاؤ گے''۔ یہ سن کر بادشاہ نے حکم دیا کہ اِس شخص کو حاضر کیا جائے۔ اِس پر وزیرِ اعظم آصف جاہ نے کہا۔ جہاں پناہ اِس شخص پر اِس طرح ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں۔ میں اِس کے حالات سے واقف ہوں وہ بہت بڑا عالم دین اور ولی اللہ ہے۔ حضور کے بہت سے امیر اور فوج کے افسر اِس کے مرید ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ پہلے اُس کے مریدوں کو دور دراز مقامات پر بدل دیا جائے پھر اُس سے باز پرس کی جائے۔ اِس پر بادشاہ نے حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کے مریدوں اور معتقدوں کو پایۂ تخت سے تبدیل کر کے دور دراز مقامات پر بھیج دیا۔ اِس کے بعد مجدّد صاحبؒ کو دربار میں طلب کیا۔

مجدّدؒ صاحب کے تشریف لانے پر جہانگیر نے اُن سے چند سوالات کیے اور اُن کے معقول و مسکت جواب ملنے پر ان کو نہایت عزت و احترام سے واپس جانے کی اجازت دے دی۔ یہ بات حاسد درباریوں کو بری لگی۔ اب اُنہوں نے دوسری طرح بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے اُنہوں نے کہا، جہاں پناہ اِس شخص کے ایک لاکھ ہتھیار بند مرید ہیں۔ اِس کے علاوہ حضور کے بڑے بڑے امراء اور فوجی افسروں میں بھی اِس کے بہت سے مرید ہیں۔ اِس طرح یہ کسی وقت بھی سلطنت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے علاوہ ازیں یہ اِس قدر مغرور اور بے ادب ہے کہ اِس نے آپ کو تعظیمی سجدہ بھی نہیں کیا۔ اِس پر جہانگیر نے مجدّدؒ صاحب کو دوبارہ طلب کیا اور حکم دیا کہ اِسے سجدہ کریں۔ مجدّدؒ صاحب نے جواب دیا کہ سجدہ اللہ کے سوائے اور کسی کو بھی کسی حالت میں جائز نہیں۔ علاوہ ازیں اے

بادشاہ تو مجھ جیسا ہی ایک مجبور و معذور انسان ہے تجھ کو سجدہ کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ بادشاہ اِس بات پر سخت غضب ناک ہوا اور مجدّدؒ صاحب کو گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا۔ جہاں وہ دو برس محبوس رہے۔ مجدّدؒ صاحب کے مرید امراء اور افسروں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ سخت برافروختہ ہوئے اور مہابت خان نے جو اُس وقت افغانستان کا حکمران تھا ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ دریائے جہلم کے کنارے دونوں لشکروں میں جنگ ہوئی جس میں مہابت خان کو فتح ہوئی اور اِس نے جہانگیر کو قید کر لیا۔ اِس کی خبر مہابت خان نے گوالیار میں مجدّدؒ صاحب کو دی اور دریافت کیا کہ اب بادشاہ کیلئے کیا حکم ہے۔ مجدّدؒ صاحب نے جواب دیا کہ بادشاہ کو چھوڑ دو اور پورے احترام اور عزت کے ساتھ دارالخلافہ جانے دو۔ اور اِس کے فرمانبردار رہو۔ یہ تحریر بادشاہ کو دکھائی گئی تو وہ مجدّدؒ صاحب کا معتقد ہو گیا۔ اور ان کو آزاد کر کے اپنے پاس بلا بھیجا اور اپنا مصاحب بنا لیا۔ اِس کے بعد مجدّدؒ صاحب کی باقی عمر دربار ہی میں گزری اور وہ مرتے دم تک ترویجِ شریعت و سنت میں مصروف رہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے سب سے زیادہ جدوجہد وحدت الوجود کے خلاف کی کیونکہ ان کی دانست میں یہ عقیدہ ہی تمام خرابیوں کی جڑ تھا۔ مجدّدؒ صاحب کی تحریر و تقریر کا یہ اثر ہوا کہ حضرت ابن عربیؒ کے دلائل و براہین بھی ماند پڑ گئے اور وجودیوں کا زور و شور ختم ہو گیا۔ اور ایک صدی تک کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ تقریر یا تحریر میں مجدّدؒ صاحب کے خلاف کچھ کہتا یا لکھتا۔ تقریباً پوری ایک صدی بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ایک رسالہ لکھا جس کا نام فیصلہ وحدت الوجود والشہود ہے اِس میں شاہ صاحب نے وحدت الوجود یا وحدت الشہود کی تائید یا تردید میں کچھ نہیں لکھا بلکہ دونوں نظریات کی تطبیق کی ہے لیکن شاہ صاحب کے اِس رسالہ کو کچھ زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی بلکہ حضرت میر ناصرؒ، میر دردؒ اور مولوی غلام یحییٰؒ نے ولی اللہ شاہ صاحبؒ کے رسالہ کی تردید میں کتابیں لکھیں اور ثابت کیا کہ وحدت الوجود غلط اور وحدت الشہود درست ہے۔ اِس موضوع پر غالباً سب سے آخری کتاب جناب مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھی ہے۔ جس کا نام "التنبیہ الطربی فی تنزیہہ ابن العربیؒ" ہے۔ حضرت تھانویؒ نے بھی دو ٹوک فیصلہ نہیں کیا کہ کونسا نظریہ درست ہے اُنھوں نے صرف یہ التزام کیا ہے کہ فصوص الحکم میں حضرت ابن عربیؒ کے جو اقوال شرع

کے خلاف اور ہدفِ اعتراضات ہیں ان کو لکھ کر حضرت ابن عربیؒ ہی کی کتاب سے ان کے وہ اقوال تحریر کر دیے ہیں جو خلاف شرع اقوال کی تردید کرتے ہیں۔

الغرض ابن عربیؒ کے زمانہ سے اب تک سینکڑوں ہی کتابیں تائید اور ترّدید میں لکھی گئیں مگر کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا اور نہ غالبًا آئندہ کبھی ہو سکے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وحدت الوجود کوئی عقلی مسئلہ نہیں کہ فلسفہ یا علم الکلام کی طرح عقلی دلائل سے ثابت یا ردّ کیا جا سکے۔ یہ مسئلہ کشف سے بھی حل نہیں ہو سکتا کیونکہ کشف شاذ و نادر ہی صاف صاف ہوتا ہے ورنہ اکثر اوقات تو رمز اور اشارہ کنائے میں ہوا کرتا ہے۔ وحدت الوجود تو آنکھ سے نظر آنے کی چیز ہے اور مشاہدہ روحانی ہی سے ثابت ہوتا ہے۔ یعنی سالک کو یہ دکھائی دیتا اور یہی اُس وقت مدرک ہوتا ہے کہ ساری کائنات صرف ایک وجود ہے اور وہی خدا ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے اور "ھُو" کے سب سے نچلے طبقہ میں سالک پر وارد ہوتی ہے۔ اب جو سالک اُسی مقام پر رہ جاتا ہے آگے یعنی اوراوپر عرش کی طرف نہیں جاتا اُس کیلئے یہ جگہ مقام بن جاتی ہے ورنہ آگے جانے والوں کیلئے یہ ایک منزل ہے۔ اب ہوا یہ کہ جناب ابن عربیؒ جب اِس جگہ پہنچے تو وہ ھُو کو ذات سمجھ بیٹھے اور خیال کیا کہ میں ذات بحت تک پہنچ گیا ہوں اور آگے جانے کا ارادہ نہ کیا یہیں رخت سفر کھول دیا۔ اب ان کا جتنا زیادہ عرصہ یہاں گزرا اتنا ہی ان کا یہ یقین پختہ ہوتا گیا کہ یہی ذات باری تعالٰی ہے اور اِس سے نیچے عالم مثال اور عالم مادی میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ اِسی ذات کی تجلیات یا شانیں ہیں اور ان سب کی اصل یہیں ہے۔ مطلب یہ کہ ان کو عرفانی غلط فہمی ہوئی اور اُنہوں نے ایک کیفیت کو حقیقت سمجھ لیا۔ اِس بات کا ثبوت اُن کے ایک قول سے بھی ملتا ہے یعنی وہ فرماتے ہیں کہ "اِس سے آگے عدم ہے اور عدم میں وحدت کی تلاش سے سوائے تکلیف و صعوبت کے اور کچھ ہاتھ نہیں آتا"۔

برخلاف ان کے جناب مجدّد الف ثانیؒ جب اِس منزل پر پہنچے تو وہ بھی یہی سمجھے کہ یہی ذات اور کائنات کی حقیقت ہے لیکن وہ زیادہ عرصہ یہاں نہیں ٹھہرے اور اوپر عرش کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ھُو کے سب سے اوپر والے طبقہ میں پہنچے اور خدا کے احکام مخلوق کی ارواح اور فرشتوں کو اوپر سے آتا دیکھا جو نیچے عالم مثال اور عالم مادی کی طرف جاتے ہوئے یہاں سے گزرتے ہیں تو اُنہوں نے خیال کیا کہ مخلوق ذات باری تعالٰی کا ظل یا سایہ

ہے لیکن جب اور اُوپر عدم میں پہنچے تو ان کو اپنا یہ خیال بھی غلط معلوم ہوا۔ اِس کے بعد انہوں نے عالم امر طے کیا عرش پر پہنچے اور ذات بحت کا مشاہدہ فرمایا تب اُن پر اصل حقیقت کھلی اور اُنہوں نے کہا کہ خدا اگرچہ کائنات کی ہر شے میں موجود ہے لیکن سب سے الگ ہے یعنی اپنا بالکل الگ وجود رکھتا ہے اور باقی جو کچھ ہے وہ سب اُس کی مخلوق ہے اور یہی تعلیم قرآن کی بھی ہے۔ انکے اِس فہم وبصیرت کا ثبوت ان کے اِس قول سے ملتا ہے کہ "پہلے میں بھی وحدتُ الوجود کو مانتا تھا لیکن جب میں نے آگے ترقی کی تو وحدتُ الوجود کی کیفیت مجھے بہت ادنیٰ نظر آئی اور مجھے یہ یقین حاصل ہوا کہ مخلوق خالق کا ظل ہے لیکن جب میں نے اور ترقی کی اور آخری مقام پر پہنچا تو مجھ پر اصل حقیقت کھلی اور مجھے معلوم ہو گیا کہ خدا، خدا ہے اور مخلوق مخلوق ہے دونوں الگ الگ دو وجود ہیں"۔ اِس سے زیادہ صاف لکھنے کی نہ تو مجھ میں ہمت ہے نہ لیاقت۔ قارئین کرام کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہ آیا تو مجھے معاف فرمائیں اور آگے کتاب کا بغور مطالعہ فرمائیں جہاں یہ سب کچھ میں نے زیادہ صاف اور واضح طور پر تحریر کیا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے متعلق چند سطور لکھوں اور بتاؤں کہ مجھے یہ سب کچھ لکھنے کا حق اور استعداد کس طرح حاصل ہوئی۔

میں ۱۹۱۱ء میں جبکہ میری عمر اٹھارہ سال تھی خاندان نقشبندیہ مجدّدیہ میں بیعت ہوا اور سات آٹھ سال کی سخت اور متواتر جدو جہد کے بعد نقشبندیہ سلوک پورا کرلیا۔ اِس سلوک سے طبیعت میں انکسار، تورع اور کشف و کرامات تو حاصل ہو گئیں لیکن جس مقصد کیلئے بیعت ہوا تھا وہ حاصل نہ ہوا یعنی رویت باری تعالیٰ حاصل نہ ہوئی۔ اِس کے بعد خاندان چشتیہ میں بیعت کی اور پانچ چھ سال میں یہ سلوک بھی طے کرلیا۔ اِس سلوک سے طبیعت میں لطافت، اخلاق میں شیرینی، حسن اور جمالیات کا ادراک اور عشق و محبت کا سوز و گداز تو میسر آ گیا لیکن رویت باری تعالیٰ یہاں بھی عنقا ہی رہی۔ اِس کے بعد اور کسی سلسلہ میں بیعت تو نہ ہوا مگر قادریہ اور دوسرے کئی سلسلوں کے سلوک کا مطالعہ بالاستیعاب کیا۔ لیکن رویت کے حصول کا وہاں بھی کوئی ذکر نہ تھا۔ اب میں خاموش ہو کر بیٹھ گیا اور کسی لطیفہ غیبی کا منتظر رہا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور ایک بزرگ سے ملاقات کرا دی۔ یہ حضرت اویسی تھے نہ خود کسی سے بیعت تھے نہ بیعت فرماتے تھے اِس لئے بیعت تو نہ ہو سکا لیکن میں

پچیس سال اِن سے فیضِ کثیر ملتا رہا۔ اب میں فیض تو اِن سے لیتا تھا لیکن ذکر و فکر وغیرہ اپنے اسی پرانے سلسلے نقشبندیہ کا کرتا تھا۔ اِس مرتبہ سلوک عجیب طرح سے طے ہوا۔ یعنی ناسوت سے ذات بحت تک سارے راستے گرد و پیش کے ماحول کو دیکھتا اور سمجھتا ہوا گزرا یعنی پہلے دوزخ کے طبقات دیکھے پھر علی الترتیب اعراف، ملکوت، جبروت، لاہوت اور ہاہوت کی جنتوں کی سیر کرتا ہوا ھُو کے نچلے طبقے میں داخل ہوا۔ یہاں مجھ پر وحدتُ الوجود کی کیفیت طاری ہوئی۔ یہ وہی کیفیت ہے جس کو جناب ابن عربیؒ صاحب نے حقیقت فرمایا ہے۔ الحمدللہ کہ میں نے یہاں زیادہ قیام نہیں کیا ورنہ میں بھی وجودی ہو کر رہ جاتا۔ جب میں ھُو کی اوپر والی سطح پر پہنچا تو وہاں وہ کیفیت نظر آئی جس کو مجدد صاحبؒ نے ظِلّیت کہا ہے۔ یہاں سے بھی جلدی ہی نجات مل گئی۔ اِس کے بعد میں کچھ عرصہ عدم میں رہا۔ لیکن برابر آگے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ عدم کو پار کر کے عالم امر میں داخل ہو گیا اور آخر کار ۲۶۔۲۷ برس کی متواتر کوشش کے بعد ۱۹۵۳ء میں اپنے مقصد حیات سے ہمکنار ہوا۔ الحمدللہ، جو چاہتا تھا مل گیا۔

یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے بخدا اِس خیال سے ہرگز نہیں لکھا کہ پڑھنے والوں پر اپنی بزرگی اور رُوحانیت و عرفان کا رُعب ڈالوں بلکہ اِس کی وجہ یہ ہے کہ وحدتُ الوجود کی حقیقت بغیر مشاہدے کے معلوم نہیں ہو سکتی اِس کو وہی شخص اچھی طرح بیان کر سکتا ہے جس نے خود دیکھا اور سمجھا ہو۔ حضرت ابن عربیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ نے جو کچھ دیکھا اور سمجھا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اِس لئے میں مجبور تھا کہ قارئین کو وحدتُ الوجود کی حقیقت کما حقہٗ سمجھانے کیلئے وہ بھی لکھ دوں جو میں نے دیکھا اور سمجھا ہے۔ اِس سے کم یا زیادہ میری اور کوئی غرض نہیں ہے۔ میں نام و نمود اور شہرت سے کوسوں دُور بھاگتا ہوں اور سچ تو یہ ہے کہ میں اگر اِس چیز کا طالب ہوتا تو ذات بحت تک پہنچ ہی نہ سکتا راستہ ہی میں رہ جاتا۔

دوسری وجہ اپنا حال لکھنے کی یہ بھی ہے کہ دورانِ سلوک میں جو میں ہر قسم کے صوفیوں اور فقیروں کی صحبت میں بیٹھا کرتا تھا تو وہاں مجھ کو بڑی بڑی عجیب معلومات حاصل ہوئیں۔ میں نے ہر طرح اور ہر رنگ کے فقیر اور درویش دیکھے مثلاً قلندر، ملنگ، رندولی، رقص و سرور

کے رسیا، مئے ناب کے متوالے اور خصوصاً رسول شاہی جو نماز روزے کو منع کرتے اور شراب اور چرس وغیرہ کو جائز بلکہ ضروری سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گناہ ثواب وغیرہ کوئی شے نہیں ہیں۔ شروع میں تو میں اِس بات پر بہت حیران ہوا کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہ خلاف شرع افعال بھی کرتے ہیں اور اِن سے کشف و کرامات بھی سرزد ہوتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب لوگ وجودی یعنی وحدت الوجود کو حق ماننے والے ہیں۔ مزید تحقیق سے مجھ پر کھلا کہ یہ لوگ اسلامی تصوف اور فقر محمدیؐ سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ ہندوؤں کے یوگ اور دوسری مشقوں کے ذریعہ روحانی طاقت پیدا کر لیتے ہیں۔

علاوہ ازیں نبی کریمؐ کے تصوف میں جو گند بعد کی صدیوں میں مل گیا ہے۔ اِس کا حال بھی مجھے معلوم ہو گیا اور اللہ کریم و کارساز نے صحیح قرآنی تصوف کا علم بھی مجھ کو عطا فرما دیا۔ یہ سب کچھ جان لینے کے بعد میں نے اِس بات کو اپنا فرض خیال کیا کہ اصل حقیقت اور سچ کو بے نقاب کر دوں۔ اِسی غرض سے میں نے ''تعمیر ملت'' لکھی جس سے راہِ خدا کے طالبوں کو بے اندازہ فائدہ ہوا اور ہو رہا ہے۔ زیر نظر کتاب ''حقیقت وحدت الوجود'' بھی میں نے اسی نیت سے لکھی ہے کہ متلاشیانِ حق غلط راہ پر پڑ کر گمراہ نہ ہونے پائیں۔ یہ کتاب عالم فاضل لوگوں کیلئے نہیں بلکہ عوام کے لیے لکھی گئی ہے اسی لیے فلسفہ علم الکلام اور تصوف کی ادق اور مغلق ناممکن الفہم اصطلاحات سے پاک ہے۔

آخر میں یہ اور عرض کر دوں کہ میں ایک بہت ہی عاجز و درماندہ، مجبور و معذور، گنہگار اور خطاوار انسان ہوں۔ زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں ہوں نہ کوئی اور دوسری خوبی مجھ میں ہے۔ اِس پر بھی میرے آقا اور میرے پروردگار نے جو بیحد و شمار نعمتیں مجھے عطا فرمائی ہیں میں ہرگز ان کا مستحق اور اہل نہ تھا لیکن جس کو پیا چاہے وہی سہاگن ہے۔ سچ ہے۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۲

مذہب کی اہمیت اور تصوّف کا مقام

یہ کتاب اگرچہ وحدتُ الوجود پر لکھی جا رہی ہے لیکن وحدتُ الوجود تصوف کا ایک مسئلہ ہے اور تصوف مذہب کا ایک جزو، اِس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے چند سطور مذہب اور تصوف پر لکھ دی جائیں تا کہ اس کے پس منظر میں اصل مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آ جائے ۔مذہب اس قدر معروف اور عام شے ہے کہ اس کی عبادات و اخلاقیات اور اوامر و نواہی کا ذکر تحصیل حاصل ہے لہٰذا ہم یہاں مذہب کی عام اور اجتماعی افادیت اور ناگزیریت پر بحث کریں گے ۔چنانچہ اس نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ روئے زمین پر جو سینکڑوں قومیں آباد ہیں وہ سب ایک دوسری سے بہت کچھ مختلف ہیں ۔بعض میں تو یہ اختلاف بہت معمولی ہے مثلاً انگریزوں، جرمنوں اور فرانسیسیوں میں، لیکن بعض قوموں میں یہ اختلاف بعد المشرقین کا سا ہے مثلاً افریقہ کے حبشیوں اور انگریزوں میں کوئی چیز بھی مشترک نظر نہیں آتی سوائے اس کے کہ یہ بھی انسان ہیں اور وہ بھی ۔پھر یہ اختلاف قوموں ہی تک محدود نہیں، ایک ہی ملک کے مختلف صوبوں کے آدمی لباس، زبان، رسوم اور صورت و شکل میں کافی مختلف ہوتے ہیں ۔پھر ایک ہی صوبے کے باشندوں میں بھی ایک دوسرے سے کافی اختلاف پایا جاتا ہے ۔یہی نہیں بلکہ ایک ہی شہر، ایک ہی محلے اور ایک ہی خاندان اور گھرانے کے لوگ اور کسی چیز میں نہیں تو صورت و شکل میں ایک دوسرے سے بالکل نہیں ملتے، حتیٰ کہ دو سگے بھائیوں کی شکل بھی بالکل ایک جیسی نہیں ہوتی ۔یہ اختلافات یہیں ختم نہیں ہو جاتے بلکہ ہر آدمی کی طبیعت، عادت اور ذہنیت بھی دوسروں سے کسی نہ کسی قدر مختلف ہوتی ہے ہر ایک کی پسند اور خواہشات دوسرے سے کسی نہ کسی حد تک جدا ہوتی ہیں ۔کسی کو مٹھاس پسند ہے تو کسی کو نمکین، کوئی ایک رنگ کو پسند کرتا ہے تو دوسرا اِس سے نفرت کرتا ہے ۔کوئی سکون و سکوت کی زندگی کا دلدادہ ہے تو کوئی

ہنگامہ آرائی اور شور وشغب کا، کوئی آرام پسند ہے تو کوئی کام پسند، کوئی شراب پر جان دیتا ہے تو کوئی اِس سے نفرت کرتا ہے، کوئی بہادر ہے تو کوئی بزدل، کوئی جنگجو ہے تو کوئی صلح جو، کسی کو لوگوں کے ستانے اور تکلیف دینے میں مزا آتا ہے تو کسی کو مخلوق خدا کی خدمت کرنے میں ۔ الغرض زندگی کے جس گوشہ کو دیکھو اختلاف و تضاد کا مجموعہ ہے ۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ اگر اس قدر مختلف الخیال اور مختلف المزاج لوگوں کو ایک قطعہ زمین میں اکٹھا بسا دیا جائے تو نتیجہ کیا نکلے گا ۔ یہی کہ وہ ہر وقت بحث و تکرار، جنگ وجدل، قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ میں مبتلا رہیں گے ۔ نہ کوئی رات کو آرام وسکون سے سو سکے گا نہ دن کو اطمینان قلب کے ساتھ کام کر سکے گا ۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں وہ گونا گوں تعمیری قوتیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہیں ہرگز بروئے کار نہ آ سکیں گی ۔ نہ کوئی بستی بس سکے گی نہ کوئی معاشرہ وجود میں آئے گا ۔ انسان جنگلی جانوروں کا ریوڑ بن کر رہ جائے گا اور معیشت و معاشرت یا تہذیب و تمدن میں بال برابر ترقی نہ ہو سکے گی ۔

لیکن حق تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی تخلیق بھی ناقص اور بیکارِ محض نہیں ۔ اس تنوع اور اختلاف میں بھی بڑی حکمت مضمر ہے ۔ حرکت اور عمل جو زندگی کی جان ہیں اسی تنوع اور اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں ۔ اگر سب لوگ ایک ہی طبیعت اور ایک ہی خیال کے ہوتے تب بھی انسان زندگی کے مختلف شعبوں میں اتنی محیرّ العقول ترقی نہ کر سکتا جو اس نے اب کی ہے ۔ اندریں حالات ضرورت کسی ایسی شے کی تھی جو اس اختلاف طبع کو کلیتہً ضائع بھی نہ ہونے دیتی اور اس کے مضرت رساں اثرات کو کم بھی کر دیتی ۔ یہ کام اللہ نے مذہب سے لیا ۔

مذہب کیا ہے؟ یہ چند ایسے قواعد و ضوابط کا مجموعہ ہے جن پر عمل کرنے سے انسان اِس دنیا میں بھی آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتا اور مرنے کے بعد بھی اچھا مقام حاصل کر سکتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے ۔ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ** o (ہم نے انسان کو تکلیفوں کے بیچ میں پیدا کیا ہے) مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا تکلیفوں کا گھر ہے جیسے کہ سمندر پانی کا گھر ہے ۔ اگر کسی کو سمندر میں پھینک دیا جائے تو

اُس کے اُوپر نیچے دائیں بائیں ہر طرف پانی ہی پانی ہوگا۔ یہی حالت اِس دنیا کی ہے۔ بچہ جس دن پیدا ہوتا ہے اس دن سے جوان اور بوڑھا ہو کر مرنے تک کسی وقت بھی تکلیفوں سے چھٹکارا نہیں پاتا۔ یہ تکلیفیں دو چار یا دس بیس نہیں بلکہ بےحدو بے شمار اور سینکڑوں قسم کی ہوتی ہیں۔ مفلسی اور ناداری، عزیز و اقارب سے ناچاقی، دوست احباب کی سرد مہری و بے وفائی، افسروں کی تنگ مزاجی اور بے جا ناراضگی، حق تلفی، تجارت میں خسارہ، زراعت میں خشک سالی، بیوی کا پھوہڑ پن، خاوند کی بدمزاجی، بچوں کی نالائقی اور نافرماں برداری، چوری، آتشزدگی، پڑوسیوں کی بے وجہ دشمنی، مقدمہ بازی، اہل کاروں اور افسروں کی بددیانتی و رشوت ستانی، موسموں کی ناخوشگواری اور بےاعتدالی اور اس کی وجہ سے طرح طرح کی بیماریاں، ڈاکٹروں اور حکیموں کی بے پرواہی، وبائیں اور جنگیں، غربت میں مہمانوں کی یورش، پیاروں کی موت، امتحانات میں ناکامی، الغرض ایک دو، دس بیس بلکہ ہزاروں ہوں تب بھی کچھ لکھا اور کہا جائے۔ یہاں تو جیسے سمندر کا پانی اتھاہ ہے۔ اِسی طرح تکلیفیں بھی لامحدود و بے شمار ہیں۔ بعض اوقات تو تعجب ہوتا ہے کہ انسان زندہ ہی کیسے رہتا ہے لیکن اگر غور اور بےتعصبی سے دیکھا جائے تو یہ مذہب اور صرف مذہب ہی ہے جو ان حالات میں بھی انسان کی ہمت کو ٹوٹنے نہیں دیتا اور حوصلے کو قائم رکھتا ہے۔ جب ایک مصیبت زدہ اپنی تمام کوششوں اور تگ و دو میں ناکام ہو جاتا ہے، جب ناکامی و نامرادی کے کالے بادل ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں، جب اپنے پرائے سب منہ پھیر لیتے ہیں، مفلسی اور ناداری کے منحوس سائے ہر طرف سے بھوتوں کی طرح لپکتے ہیں، جب چاروں طرف گھور اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے، آس اور امید کی ہلکی سی کرن بھی کہیں دکھائی نہیں دیتی، جب کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل بھاگنے اور مرنے کو جی چاہتا ہے، اس وقت، ہاں بالکل اُسی وقت! مذہب ہی آڑے آتا ہے اور اسے گلے لگا لیتا ہے اور خداوند رحیم و کریم کی بے پناہ رحمت و شفقت اور امداد و نصرت کا یقین دلا کر **لَا تَقْنَطُوْ مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ** (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو) کا مژدہ

سنا تا ہے اور خودکشی کر کے کتے کی موت مرنے سے بچا لیتا ہے۔ مذہب کا یہ پیام قدوسی تنِ مردہ میں نئی روح پھونک دیتا ہے، وہ پھانسی کا پھندا گلے سے نکال کر ایک نئے ولولے اور جوشِ عمل کے ساتھ اُٹھتا، مصائب کے پہاڑوں سے ٹکرا کر ان کو ریزہ ریزہ کرتا، مخالفتوں کو کچلتا، تکلیفوں پر مسکراتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اندھیرا چھٹنے لگتا ہے، امیدوں کے دیئے روشن ہو جاتے ہیں اور آخر کار کامرانی و کامیابی اُس کے قدموں پر سر رکھ دیتی ہے یہ محض افسانہ اور شاعری نہیں ہے، دیکھنے اور غور کرنے سے آپ کو اپنے اردگرد ایسے زندہ واقعات اکثر و بیشتر نظر آ سکتے ہیں۔

مذہب کا کام صرف اتنا ہی نہیں۔ یہ تو زندگی کے ہر گوشہ اور ہر موڑ پر انسان کی رہنمائی کرتا ہے خصوصاً ہمارا مذہب اسلام تو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے سلسلہ میں عبادت و تقویٰ، معیشت و معاشرت، قیادت و سیاست وغیرہ کے سارے اصول مقرر کر دیئے گئے ہیں بلکہ چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، نہانے دھونے، طہارت و ناپاکی، بولنے چالنے، ملنے ملانے اور کھانے پینے تک کے آداب و قواعد پوری وضاحت سے بتا دیئے گئے ہیں۔ مذہب نے انسان کے تمام اعمال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک شر ہے دوسرا خیر۔ ایسے کام جو انسان کی تکلیف و تخریب کا باعث ہوں شر کہلاتے ہیں اور ایسے اعمال و افعال جو اس کی راحت و تعمیر کا سبب ہوں ان کو خیر کہتے ہیں۔ انہی کا دوسرا نام نواہی اور اوامر ہے۔ یہ خیر و شر اور اوامر و نواہی اِس قدر معلوم و معروف ہیں کہ یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک جانتا اور مانتا ہے۔ یہ بھی سبھی جانتے ہیں کہ جب تک کسی قانون کے پیچھے قانون شکن لوگوں کو سزا دینے کی طاقت موجود نہ ہو وہ قانون بیکار رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے قانون کی کتاب یعنی قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بیسیوں جگہ خوب کھول کھول کر بتا دیا ہے کہ اللہ تمام کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کی ہر شے پر قادر ہے۔ وہ حاضر و ناظر ہے، سمیع و بصیر ہے۔ رات کے اندھیرے میں چیونٹی کو بے تکلف دیکھتا اور اس کے چلنے کی آواز سنتا ہے۔ وہ ہر شخص کے

نیک و بداعمال کو ہر وقت دیکھتا بلکہ ہر شخص کے دل میں جو خیالات گذرتے ہیں ان سے بھی واقف رہتا ہے۔اُس نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ جولوگ حکم عدولی اور قانون شکنی کریں گے ان کیلئے دوزخ کا عذاب ہے اور جو نیکوکار ہوں گے ان کا صلہ جنت ہے۔ دوزخ کی تکالیف اور جنت کی نعمتوں کا بیان بھی کھول کھول کر کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مرنے کے بعد پھر زندگی ہے اور یہ کہ قیامت کا دن برحق ہے۔اس کے علاوہ فرشتوں، رسولوں اور قرآن کے علاوہ دوسری الہامی کتابوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور سب پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ یہ سب غیب میں ہیں۔اب حکم یہ ہے کہ ان کو بغیر دیکھے اور بلا کسی دلیل کے مان لو۔

الغرض یہ ہے مذہب جس نے انسان کو انسان سے محبت کرنا سکھایا اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کے کام آنے بلکہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو راحت و آرام پہنچانے کا سبق دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کروڑوں آدمی جو شکل وصورت، رنگ روپ اور عادت و ذہنیت میں ایک دوسرے سے مختلف تھے آپس میں وابستہ و پیوستہ ہو کر اس طرح گھل مل گئے کہ گویا ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء ہیں۔اس طرح ہر ملک میں ایک قوم اور ایک معاشرہ وجود میں آیا اور ایسا امن وامان قائم ہو گیا جس میں ہر شخص کو اپنی خداداد قابلیتوں اور طاقتوں کو بروئے کار لانے کا موقع ملا اور ہر آدمی اپنی اُمنگوں اور خواہشوں کے حصول میں کسی نہ کسی حد تک ضرور کامیاب ہو گیا۔

حقیقتاً سب سے بڑی نعمت جو مذہب نے انسان کو عطا کی امن وامان ہے موجودہ زمانہ کی علمی، ادبی، صنعتی، اقتصادی، سیاسی، زرعی، سائنسی اور حربی، الغرض ہر طرح کی ترقی امن وامان اور صرف امن وامان کی مرہون منت ہے۔امن وامان نہ ہوتا تو نہ انسان کو طرح طرح کے علوم حاصل کرنے کا موقع ملتا نہ یہ ایجادات واختراعات وجود میں آتیں، نہ تمدن اتنی ترقی کرتا لیکن افسوس ہے کہ ہم لوگوں کے دل میں امن وامان کی کوئی

خاص قدر و منزلت نہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ جنہوں نے امن و امان کے زمانہ میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی ہو اور جن کو لاقانونیت اور بدامنی سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو وہ کسی طرح بھی نہیں سمجھ سکتے کہ بدامنی کی حالت میں انسان پر کیا کچھ گذر جاتی ہے۔ پاکستان میں تو امن و امان کی قدر و قیمت کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو تقسیم ہند کے وقت مشرقی پنجاب اور دہلی وغیرہ کے قرب و جوار میں مقیم تھے اور خود خاک و خون کے سمندر میں سے پا پیادہ گذر کر پاکستان آئے تھے۔ تقسیم ہند کے وقت جولائی سے نومبر تک لاکھوں مسلمان شہید ہوئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ عورتوں کی بے حرمتی ہوئی۔ دور کیوں جایئے ابھی مشرقی پاکستان میں اسی لاقانونیت کی وجہ سے جو حشر برپا ہوا کل کی بات ہے۔ بھارتی ہندوؤں اور پاکستانی بنگالیوں کے ہاتھوں لاکھوں بنگالی اور غیر بنگالی قتل کر دئے گئے، ہزاروں عورتوں کی بے حرمتی ہوئی اور کروڑوں روپیہ کا نقصان ہوا اور یہ سب کچھ مذہب کے باغی، ہوس پرست، اقتدار پسند مسلمانوں نے ہندوؤں کی شہ پر کیا۔ اللہ ہم سب کو ایسی مصیبت سے آئندہ محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔ اب ہم تقسیم ہند کے وقت جو ہزاروں واقعات قتل و غارت وغیرہ کے پیش آئے ان میں سے صرف ایک سچا واقعہ تحریر کرتے ہیں۔ شاید اس کو پڑھ کر امن و امان کی برکت اور حقیقی قدر و قیمت آپ کے ذہن نشین ہو جائے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء کی ابتدائی تاریخیں تھیں اور صبح کے آٹھ بجے تھے۔ ایک کلاس ون افسر سب بال بچوں اور بیوی سمیت اپنی کوٹھی میں ناشتہ کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ حالات و واقعات کی وجہ سے سبھی متفکر و پریشان تھے لیکن یہ اطمینان تھا کہ کوٹھی کے دروازہ پر پولیس کا پہرہ ہے ابھی دو چار لقمے بھی نہ کھائے ہوں گے کہ ہندوؤں اور سکھوں کا ایک غول پہرہ کے سپاہیوں کو بے بس کر کے اندر گھس آیا اور غنڈوں کے لیڈر نے صاحب موصوف سے کہا کہ جیسے بیٹھے ہو ویسے ہی اُٹھ کر کوٹھی سے باہر نکل جاؤ اور جہاں دل چاہے چلے

جاؤ۔ذرہ بھی دیر کی تو سب کو قتل کردیا جائے گا۔صاحب موصوف بےچارے کیا کرتے ہاتھ کا لقمہ ہاتھ میں اور منہ کا منہ میں، بال بچوں سمیت کوٹھی سے باہر نکل آئے اور ارادہ کیا کہ جامع مسجد میں جو پناہ گزینوں کا کیمپ پڑا ہے وہاں چلے جائیں ۔دو ہی قدم چلے ہونگے کہ اسی کوٹھی کے بھنگی نے صاحب کی بڑی لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ "اسے تو میں نہ جانے دوں گا"۔اس پر صاحب موصوف کو قدرتاً غصہ آیا اور وہ بھنگی کو مارنے کے لیے آگے بڑھے ہی تھے کہ دو تین کرپان بند سکھوں نے روک دیا اور کہا خبردار جو اس کو کچھ کہا ،جانے دو اس لڑکی کو ورنہ سر اڑا دوں گا۔چنانچہ صاحب موصوف مجبور ہو گئے اور یہ لُٹا پٹا قافلہ جامعہ مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔خدا کے واسطے ایک لمحہ کے لیے سوچئے کہ اس وقت صاحب موصوف اور اس بچی کی ماں اور بھائی بہنوں کے دل پر کیا قیامت گزری ہوگی ۔خاکم بدہن خدانخواستہ اگر یہ واقعہ ہم لوگوں میں سے کسی کو پیش آئے تو ہماری کیا حالت ہوگی۔**اناللہ وانا الیہ راجعون ۔**

ہم نے یہ سب کچھ آپ کو یہ بتانے کے لیے لکھا ہے کہ انسان کو زندہ و سلامت رہنے اور ترقی کرنے کے لیے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے ۔اگر مذہب نہ ہوتا تو آج یہ دنیا ویران اور وحشی انسانوں کا مسکن ہوتی ۔اس لیے مذہب کے دامن کو مضبوط تھامو اور جو چیز حدیث و قرآن کے خلاف ہو اس کو نیست و نابود کردو خواہ وہ کوئی فیشن ہو یا رسم یا کوئی علم ہو مثلاً تصوف یا کوئی اور نظریہ ہو مثلاً وحدت الوجود،اصل چیز مذہب اور شرع ہے ،تصوف تو بہت بعد کی بات ہے ۔شرع ہر زمانہ، ہر حالت،اور ہر وقت تصوف پر فضیلت و فوقیت رکھتی ہے ۔دُنیا کے ساٹھ ستر کروڑ مسلمانوں کو عزت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے سختی سے پابندیٔ مذہب کی ضرورت ہے ۔تصوف کتنے آدمی سیکھتے ہیں؟مشکل سے چند لاکھ!اور کتنے کامیاب ہوتے ہیں؟مشکل سے چند سو!پھر آج جبکہ جاہل اور نقلی پیروں نے اصل تصوف کی صورت ہی مسخ کردی ہے کون کہہ سکتا ہے کہ سچا تصوف کیا ہے،اصل بزرگ اور ولی کون

ہے اور نقلی اور جعلی کون۔ اِس لئے میرے عزیزو! مذہب کو اختیار کرو، مذہب کو بچاؤ، یہی تم کو آخر تک بچائے گا۔ تصوف اور وحدت الوجود تمہارے کسی کام نہ آئے گا۔ اب ہم تصوف اور وحدت الوجود کے بارے میں چند سطور لکھ کر اس باب کو ختم کر دیں گے اور اگلے ابواب میں مسئلہ وحدت الوجود پر بحث کریں گے۔ **وَمَا تَوْفِيْقِي اِلَّا بِاللّٰهِ**o

☆تصوف اور وحدتُ الوجود

پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ مذہب کی بنیاد اِن عقیدوں پر ہے ۔ اللہ، فرشتے، الہامی کتابیں، رسول، قیامت اور حیات بعد الموت ۔ اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہم اِن سب پر بغیر دیکھے اور بلا کسی دلیل کے ایمان لے آئیں۔ دنیا میں اس وقت تقریباً ساٹھ ستر کروڑ مسلمان بستے ہیں اور سبھی ان عقائد کو بلا دلیل ہی مانتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے کچھ دماغ ایسے بھی بنائے ہیں جو کسی بات کو بھی بغیر دیکھے اور بلا سمجھے ماننے کو تیار نہیں ہوتے لیکن آج کی دنیا کے تمام عالموں، فلاسفروں اور دانشوروں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کو دلائل عقلی سے ثابت کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ وہ صرف وجدان ہی سے سمجھ میں آ سکتا اور دکھائی بھی دے سکتا ہے۔ چنانچہ یہی موضوع علم تصوف کا ہے۔ دنیا میں جتنے علم ہیں سب میں یہ ہوتا ہے کہ طالب علم پہلے علم حاصل کرتا اور پھر اس پر عمل کرتا ہے۔ لیکن تصوف میں ان سب کے برخلاف پہلے عمل کرنا پڑتا ہے پھر علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ عمل کیا ہے؟ یہ کسی شیخ، ولی یا عارف کا بنایا اور بتایا ہوا عمل نہیں ہے بلکہ خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اِس علم کی ابتدا اور انتہا ایک چھوٹی سی آیت میں بیان کر دی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ **وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا** o (اپنے رب کے نام کا ذکر کرو اور سب کو چھوڑ کر اُسی کے ہو جاؤ) یہاں سب کو چھوڑ دینے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ دنیا چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھو کیونکہ یہ تو رہبانیت ہے جو اسلام میں منع ہے۔ یہاں سب کو چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ دلی تعلق سوائے خدا کے اور کسی سے نہ رکھو۔ سب

جانتے ہیں کہ رب ایک صفاتی نام ہے۔ ذاتی نام تو خدا کا اللہ ہے۔ اِس طرح معلوم ہوا کہ عمل کی ابتدا لفظ اللہ کے ذکر سے ہوتی ہے اور جب سالک اعلیٰ مدارج پر پہنچتا ہے تو اس کو دلی تعلق سب سے چھوڑ کر صرف اللہ سے قائم کرنا پڑتا ہے اِسی کو تصوف کی اصطلاح میں قطع ماسویٰ اللہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کے کام بھی کرتے رہو اور اپنے خالق کو بھی کسی وقت مت بھولو۔ دین اور دنیا میں رابطہ قائم رکھنا بہت ضروری ہے۔

اِس ابتداء اور انتہا کے درمیان اور بھی کئی باتیں اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں مثلاً ایک تو ذکر کرنے کا قاعدہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ **وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ** o (اور اپنے رب کو دل میں یاد کیا کرو زاری اور ڈر سے، زبان سے آواز نکالے بغیر صبح و شام اور غافلوں میں سے مت ہونا) دوسری آیت میں ارشاد ہے۔ **فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ** o (اور جب نماز ختم کر چکو تو اللہ کو یاد کیا کرو، اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہوئے) ان میں سے پہلی آیت میں صرف صبح و شام ذکر کرنے کی ہدایت ہے لیکن دوسری آیت میں پانچوں وقت کی نماز کے بعد ذکر کرنے کا حکم ہے۔ اور وقت کا کوئی تعین بھی نہیں ہے۔ ان دونوں آیتوں سے بزرگانِ دین نے چوبیس گھنٹے کا ذکر لازم کر لیا اور اس کو پاس انفاس کا نام دیا چنانچہ صدیوں سے اِسی پر عمل ہو رہا ہے اور یہ عین قرآن پاک کے مطابق ہے۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے ابتداء اور انتہائے سلوک کے درمیان دو اور چیزوں کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک ہے تزکیہء اخلاق اور دوسری تصفیہء قلب، ظاہر ہے کہ ان دو باتوں کی تکمیل کے بغیر سالک خدا کے قرب میں ہرگز باریاب نہیں ہو سکتا۔ اخلاق کی بابت تو احادیث اور قرآن میں یہاں تک زور دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر جنت میں بھی داخلہ نہ ہو سکے گا۔ تصفیہء قلب بھی تزکیہء اخلاق سے کسی طرح کم ضروری نہیں اگر آپ کسی معمولی سے معزز مہمان کو بھی اپنے گھر بلائیں تو پہلے گھر کو خوب پاک صاف کر لیتے ہیں تب بلاتے

ہیں۔مومن کا قلب اللہ کا گھر ہے۔اگر آپ چاہتے ہیں کہ اِس کی تجلّی اور اِس کا نور اپنے دل میں دیکھیں تو جب تک پوری پوری صفائی نہ ہو یہ کسی طرح ہو ہی نہیں سکتا۔ہم اِس جگہ ایک بڑی ہی پیاری مثال دیتے ہیں شاید اسی سے آپ کی سمجھ میں کچھ آ جائے۔

ہر گھر میں بجلی کے بلب جلتے ہیں۔ایک بلب کا شیشہ الگ کر کے سوئچ دبائیں تانبے کا تار گرم ہو کر سرخ ہو جائے گا لیکن روشنی نہ ہوگی۔اب شیشہ چڑھا کر سوئچ دبائیں اب بھی تار گرم و سرخ ہو جائیں گے روشنی نہ ہوگی۔اب اگر شیشہ کی ہوا خارج کر کے اور ویکیوم کر کے شیشہ لگائیں اور پھر سوئچ دبائیں تو فوراً نور پیدا ہوگا اور روشنی ہو جائیگی وجہ یہ ہے کہ پہلے شیشہ میں ہوا بھری ہوئی تھی اس لیے نور پیدا نہیں ہوا۔جب ہوا نکال دی گئی تو فوراً نور پیدا ہو گیا۔آپ کے قلب میں بھی جب تک ہوا (ہوس وغیرہ) بھری ہوئی ہے اللہ کا نور اس میں جلوہ نما نہیں ہو سکتا۔دنیا کی ہوا و ہوس سے قلب کو پاک کر لو قلب بھی بلب کی طرح روشن ہو جائے گا۔بس جناب یہ ہے اللہ اور رسولؐ کا بتایا اور سکھایا ہوا تصوف اور سلوک۔اس کے علاوہ جو بہت سی چیزیں اس میں ملا دی گئی ہیں وہ سب لزوم مالا یلزم ہیں مثلاً حبسِ دم سے ذکر کرنا،طرح طرح کے آسن لگا کر ذکر کرنا،خاص خاص آسنوں سے مراقبہ کرنا،الٹے لٹک کر نمازِ معکوس پڑھنا،ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر پورا قرآن ختم کرنا،کئی کئی دن متواتر افطار کئے بغیر روزے رکھنا وغیرہ وغیرہ۔اس کے علاوہ دعائے حزب البحر،دعائے ماثورہ،دعائے سُریانی،قصیدہ بردہ اور قصیدہ غوثیہ وغیرہ جو بطور اعمال کے سلوک میں شامل کر لیے گئے ہیں۔اس میں شک نہیں کہ ان سے طرح طرح کے فوائد ضرور ہوتے ہیں خاص کر فراخیءِ رزق و کشادگیٔ احوال، لیکن سلوک طے کرنے میں اور خدا تک پہنچنے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ایک اور بھی چیز ہے جو ذکر،تزکیہءِ اخلاق،تصفیہءِ قلب اور قطع ماسوئ اللہ سے بھی زیادہ ضروری ہے،وہ ہے ایک کامل مرشد کا تلمذ اور توسّل،مرشد کے بغیر اس راہ میں دو قدم چلنا بھی ممکن نہیں۔جب

معمولی معمولی علوم وفنون کے لیے بھی استاد کی ضرورت ہوتی ہےتو روحانی عالم میں کروڑوں اور اربوں میل کا فاصلہ طے کر کے حریم کبریا تک پہنچنا بغیر کسی رہنما کے کس طرح ممکن ہوسکتا ہے ۔ رہنمائی اور ہدایت کے علاوہ مرشد کامل کے سینہ سے ایک ایسی برقی طاقت وتوانائی سالک کوملتی ہے جواس کے قلب کوگرما کراور روح کوتڑپا کرایک نئی زندگی بخشتی ہے ۔ یہ ایک خاص قسم کی حرارت ہوتی ہےاس سے وہ جذب اور سرور وکیف پیدا ہوتا ہے جس کے نشہ اور بے خودی میں سالک ہر قسم کی سختیاں اور تکالیف خوشی سے برداشت کرتا ہوا منزلِ مقصود تک چلا جاتا ہے ۔

اگر اس طرح باقاعدہ سلوک طے کیا جائےتو دو چار مہینے بعد ہی سالک کو عجیب و غریب کوائف و واردات سے واسطہ پڑتا ہے ۔ سب سے پہلےتو کشف و کرامات کی طاقت پیدا ہوتی ہے،اس کے بعد اولیاءاللہ کی روحوں کی زیارت اور عالم روحانی کی سیر میسر آتی ہے ۔کبھی وہ دیکھتا ہے کہ کائنات کی ہر شے شجر وحجر وغیرہ اللہ تعالٰی کی تسبیح وتہلیل میں مصروف ہیں ،کبھی اسے نظر آتا ہے کہ یہ سب چیزیں خوداس کوسجدہ کررہی ہیں ،کبھی تمام چیزیں نظر سے غائب ہوجاتی ہیں ۔کبھی سینکڑوں میل تک ہر چیز نظر آنے لگتی ہے ۔کبھی اسے محسوس ہوتا ہے کہ ساری کائنات خوداس کی ذات میں جذب ہوگئی ہےاور کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ خوداس کی ذات ساری کائنات میں جاری وساری ہے ۔اب جیسے جیسے وہ ترقی کرتا اور آگے بڑھتا ہے عجیب سے عجیب تر مشاہدات و واردات پیش آتی ہیں ۔ یہاں تک کہ جب **ھو** میں ایک خاص مقام پر پہنچتا ہےتو اس کو یہ نظر آتا ہے کہ ہر جگہ خدا ہی خدا ہے ۔اس کے علاوہ اور کوئی ہستی موجود نہیں ۔اسی مشاہدے کا نام وحدت الوجود ہے ۔مگر یہ سب کچھ جو دکھائی دیتا یا محسوس ہوتا ہےایک کیفیت ہوتی ہےحقیقت نہیں ہوتی ۔ چونکہ وحدت الوجود کا بیان ہم نے اگلے ابواب میں نہایت شرح وبسط سے قلمبند کیا ہےاس لیے یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں آگے ملاحظہ فرمائیں ۔

۳

کائنات حادث ہے یا قدیم

یہ مسئلہ اس سوال کے جوابات سے پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی یا یہ پیدا کی گئی ہے۔ اور فنا ہو جائے گی۔ اگر پیدا کی گئی ہے تو اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، کہاں ہے اور اس کا اس کائنات سے کیا رابطہ اور تعلق ہے؟

یہ سوال نیا نہیں ہے بلکہ جب سے انسان کا دماغ علم کی روشنی سے منور ہوا اور اس کو تفکر و تحقیق کی عادت پڑی اس دن سے یہ سوال اس کے غور و فکر کی جولا نگاہ بنا رہا ہے اور ہزاروں مفکرین نے اپنے اپنے علم اور عقل کے مطابق اس کے جواب دیئے ہیں مثلاً

1۔ مفکرین کا ایک گروہ کہتا ہے کہ کائنات سے مراد مادہ ہے اور مادہ ازلی و ابدی ہے، یہ نہ کبھی پیدا ہوا نہ کبھی فنا ہوگا۔ اس پر ان مفکرین سے کہا گیا کہ مادہ تو ایک جامد شے ہے پھر اس میں یہ تغیر و تبدل کیوں ہوتا ہے اور یہ مختلف صورتیں کیسے اختیار کر لیتا ہے؟ تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ یہ تغیر و تبدل اور طرح طرح کی شکلیں بدلنا مادہ کی عادت اور فطرت ہے مثلاً کبھی یخ اور برف کی شکل میں ہے تو کبھی پگھل کر پانی بن جاتا ہے اور کبھی بھاپ بن کر نظر سے غائب ہو جاتا ہے حالانکہ فضا میں موجود رہتا ہے۔ یہی حال دوسری مادّی اشیاء کا بھی ہے کہ وہ صورتیں بدلتی رہتی ہیں حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے ذروں بلکہ ایٹموں میں تبدیل ہو کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں مگر فنا نہیں ہوتیں۔

اب اگر ان سے پوچھیں کہ پھر یہ حرکت اور جان کیا چیز ہے؟ تو وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی مادہ کی ایک خاصیت ہے۔ مادہ میں بہت سے عناصر موجود ہیں، جب کچھ عناصر کسی خاص تناسب سے مل کر ایک جسم بن جاتے ہیں اور اس جسم کو ایک خاص ماحول میں ایک

خاص درجہ کی گرمی اور نمی پہنچتی ہے تو اس جسم میں ایک خاص قسم کی حرارت پیدا ہو جاتی ہے جس کو ہم "جان" کہتے ہیں ۔یہی حرارت اس مادی جسم کو متحرک بھی کر دیتی ہے ۔

یہاں تک تو بات کچھ سمجھ میں بھی آ جاتی ہے لیکن جب ہم اِن مفکرین سے دریافت کرتے ہیں کہ اچھا تو پھر خواہش، عقل، جذبات اور وجدان کیا چیزیں ہیں، یہ مادے میں کس طرح پیدا ہو جاتی ہیں تو یہ لوگ کوئی قابل فہم جواب نہیں دے سکتے اور یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ بھی مادّے ہی کے خواص ہیں ۔بہر حال اب جب کہ ایٹموں کو توڑ کر ایٹمی توانائی پیدا کی جارہی ہے یہ مادّہ پرست بھی اپنے نظریہ کے قائل نہیں رہے بلکہ انہوں نے مان لیا ہے کہ مادّی عالم سے ماوراء ایک اور عالم بھی ہے جو قطعاً غیر مادّی ہے ۔

2 ۔دوسرا جواب ہندو مفکرین کا ایک گروہ یہ دیتا ہے کہ اس کائنات میں تین چیزیں ایسی ہیں جو قدیم ہیں ۔ان میں سے ایک مادّہ ہے ،دوسری روح ہے ، تیسرا خدا ہے ۔مادّہ خود اپنی صورت و شکل نہیں بدل سکتا بلکہ خدا اس کو جس شکل و صورت میں ڈھالنا چاہے ڈھال سکتا ہے ۔روح کی خاصیت یہ ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے مادّی اجسام میں حلول کر جاتی ہے اور ان کو حرکت دیتی ہے ۔مختلف اعمال و افعال بھی روح ہی سے سرزد ہوتے ہیں ۔خدا کا کام صرف یہ ہے کہ جب روحوں کی ایک زندگی ختم ہو تو ان کے اپنے اپنے اعمال کے مطابق کسی دوسرے مادّی قالب میں ڈال کر پھر پیدا کر دے اور یہ بھی وہ ایک خاص قانون کے مطابق کرتا ہے ۔

3 ۔مفکرین کی ایک اور جماعت کہتی ہے کہ کائنات حادث ہے یعنی پیدا کی گئی ہے اور فنا ہو جائے گی ۔اس کا ایک پیدا کرنے والا بھی ہے، وہی اس کائنات کی اشیاء کو پیدا اور فنا کرتا رہتا ہے، اسی کا نام خدا ہے، وہ قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا ۔یہ مفکرین خدا کو ایک طاقت مانتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ وہ ایک مشین کی

طرح ایک قاعدے اور قانون کے مطابق کام کرتا ہے، یعنی اپنی مرضی اور ارادے سے جو چاہے وہ کرنے میں آزاد نہیں ہے بلکہ خود ایک قانون کا پابند ہے۔

4۔ ایک اور جماعت ہے جو کہتی ہے کہ کائنات بے شبہ حادث ہے لیکن اس کا پیدا کرنے والا ایک خدا نہیں دو خدا ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ کائنات میں خوب و زشت، نیک و بد اور خیر و شر پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں اور ہر انسان میں نیکی اور بدی دونوں طاقتیں موجود ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک ہی خدا انسان کو نیکی کرنے کی ہدایت کرے اور پھر خود ہی اس کو بدی پر ابھارے۔ یہ لوگ خیر یا نیکی کے خدا کو یزداں اور بدی یا شر کے خدا کو اہرمن کہتے ہیں۔

5۔ مفکرین یا فلاسفروں کی ایک اور جماعت کائنات کو حادث اور خدا کو قدیم مانتی ہے، ان کا نظریہ تقریباً وہی ہے جو الہامی مذاہب کا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لوگ بچپن ہی میں مذہبی خیالات سے متاثر ہو جاتے ہیں اور وہی تاثر ان کے لاشعور میں موجود اور ان کے دماغ پر چھایا رہتا ہے ورنہ خدا کا وجود محض عقلی اور منطقی استدلال سے ثابت کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ یہ مفکرین خدا کو محض مشینی خدا نہیں مانتے بلکہ ایک بالارادہ فعال ہستی تصور کرتے ہیں۔ پھر بھی کائنات اور خدا کے باہمی رابطے اور تعلق کی بابت ان میں کافی اختلافات موجود ہیں۔

6۔ ایک جماعت انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ کائنات حادث اور خدا قدیم ہے، خدا ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ وہ اپنی مخلوق پر اختیار مطلق رکھتا ہے، وہ ذات و صفات میں ہر لحاظ سے یکتا اور بے مثال ہے، اس کو کائنات کے ایک ایک ذرہ کا ہر وقت پورا علم رہتا ہے۔ وہ انسان کے وہم و گمان، عقل و قیاس اور علم سے بہت بالاتر ہے۔ اس کی ماہیت و حقیقت کسی کی عقل میں نہیں آ سکتی۔ انبیاء علیہم السلام کا

علمِ وحی پر مبنی ہے اور جو آدمی وحی پر ایمان لاتا اور اس کو سچ سمجھتا ہے مسلمان کہلاتا ہے۔

7۔ایک اور جماعت ہے جو وحدت الوجود کی قائل ہے، یہ لوگ وجودی کہلاتے ہیں۔ان کا نظریہ یہ ہے کہ ''وجود ایک ہے اور وہی خدا ہے'' وجود سے ان کی مراد کل کائنات ہے مع ان تمام اشیاء کے جو اس میں موجود ہیں، خواہ ان کا علم ہمیں ہو یا نہ ہو، ہم کو نظر آتی ہوں یا نہ آتی ہوں، وہ ہمارے حواس ظاہری اور عقل سے معلوم و محقق ہوسکتی ہوں یا نہ ہوسکتی ہوں ۔مثلاً ہوا ،برقی اور مقناطیسی قوت ،ایثر، جنات، فرشتے، ارواح اور خود خدائے بزرگ و برتر۔اس کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ ایک سمندر ہے اتھاہ بیکراں، بس وہی موجود ہے، اس کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں۔ اس میں جو طرح طرح کی موجیں اٹھتی ہیں مختلف شکلیں اور نقوش بنتے ہیں اور حباب وغیرہ پیدا ہوتے ہیں وہ سب اسی سمندر کی مختلف شکلیں ہیں۔بالکل اسی طرح یہ ساری کائنات ایک وجود ہے اور یہی خدا ہے۔کائنات میں مختلف صور و اشکال ظاہر اور غائب ہوتی رہتی ہیں یا یوں کہیئے کہ پیدا ہوتی اور مٹتی رہتی ہیں، خواہ وہ بڑے بڑے ستارے اور سیارے ہوں یا کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز مثلاً چیونٹی اور جھینگے وغیرہ۔یہ سب اسی وجود یعنی خدا کی تجلیات ہیں۔جو ظہور پذیر ہوتی اور غائب ہوجاتی ہیں۔

متذکرہ بالا نظریات و عقائد کے علاوہ مختلف مذاہب میں کائنات اور تخلیق کائنات کے متعلق اور بھی کئی نظریے موجود ہیں۔لیکن وہ قابل ذکر نہیں اور یہاں ان کا بیان باعث طوالت بھی ہوگا۔اس لئے نظر انداز کیے جاتے ہیں۔

انسانی تخیّل کی پرواز اور وحیِ الٰہی

سوال مندرجہ عنوان کے سات جواب اوپر لکھے گئے ہیں ان میں سے پہلے پانچ مفکرین کے غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ان مفکرین نے اپنے جوابات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بے شمار کتابیں لکھیں اور استدلال عقلی سے اپنے اپنے دعوے کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔چھٹا جواب الہامی ہے جو وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو دیا اور ان کے توسل سے ہم تک پہنچا۔ساتواں جواب وجدان وسلوک یعنی روحانی کشف ومشاہدے پر مبنی ہے۔

آیئے اب شروع کے پانچ سوالوں پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انسانی تخیل کی پرواز کہاں کہاں تک ہے اور اس کا فکر کسی مسئلے کو حل کرنے کے لیے کیا کیا انداز اختیار کرتا ہے۔مگر اس سے پہلے دو تین باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیں۔

اول یہ کہ ہر انسان کسی بات یا مسئلہ کا جواب اپنے علم اور تجربے کے مطابق ہی دے سکتا ہے لیکن انسانوں کا علم اور تجربہ ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوا کرتا ہے، بعض حالتوں میں تو اس اختلاف میں زمین وآسمان کا سا بُعد ہوتا ہے جو تضاد تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر مسئلہ زیر تحقیق کسی ایسی شے کے متعلق ہو کہ انسان کا علم اس کو محیط ہو سکے یعنی وہ حواس ظاہری کی مدد سے اس شے کا تجزیہ وتحلیل یا پیمائش وغیرہ کرنے پر قادر ہو یا عقل وتجربہ سے اس کے خواص معلوم کر سکے تو جواب آسانی سے حاصل ہوگا اور اس کی صحت کا یقین بھی آجائیگا۔لیکن اگر معاملہ برعکس ہو یعنی زیر تحقیق شے حواس ظاہری کی دسترس سے باہر ہو اور انسان صرف عقل وتجربہ ہی سے اس کا علم حاصل کر سکے اور اپنی تحقیق کو چند علمی قاعدوں اور کلیوں کی مدد سے صحیح بھی ثابت

کردے تب بھی عقل تو یہی کہتی ہے کہ جواب کی صحت پر اتنا یقین ہرگز نہیں کیا جا سکتا جتنا کہ پہلی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔

اب ایک تیسری صورت اور بھی ہے یعنی اگر زیرِ تحقیق شے ایسی ہو کہ نہ حواس ظاہری سے تحقیق و معلوم ہو سکے نہ عقل میں آ سکے۔ نہ انسان کا علم اس کو محیط ہو سکے تو ایسی صورت میں محض استدلال عقلی سے جو کچھ معلوم ہوگا وہ صرف انسانی تخیل اور تفکر کی تخلیق ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی تائید میں عقلی اور علمی دلائل بھی موجود ہوں اور انسانی ذہن منطقی استدلال کی بنا پر اسے ماننے پر مجبور بھی ہو جائے پھر بھی پورے یقین اور وثوق سے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ تحقیق سو فی صدی درست ہے۔

1۔ اب اگر ہم جواب نمبر ایک کو پڑھیں تو ایک ہی نظر میں معلوم ہو جائیگا کہ سوال پر غور و خوض کرتے وقت مادہ پرستوں کو صرف مادہ ہی نظر آتا تھا۔ اور مادے کے اندر یا فضا اور خلاء میں جو غیر مادی اشیاء مستور ہیں مثلاً مقناطیسی اور برقی قوت، ایتھر، کشش ثقل وغیرہ، ان کا کچھ علم ان کو نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے نہایت آسانی سے کہہ دیا کہ "مادہ ہی اصل وجود ہے اور یہی ازلی و ابدی ہے"۔ اور حقیقت میں یہی جواب سب سے آسان بھی ہے کہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہی کہہ دیا جائے۔ یہ انسانی دماغ کی بالکل ابتدائی کیفیت ہے کہ جو کچھ بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے وہی کہہ دیتا ہے۔ فکر کرنے اور زیادہ سوچنے کی اس ابتدائی ذہنی حالت میں نہ اہلیت ہوتی ہے نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے چنانچہ جب ان کے جواب پر جرح کی جائے کہ مادہ تو ایک جامد شے ہے یہ خود بخود مختلف صورتیں اور شکلیں کس طرح بدل لیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جتنے بھی جاندار ہیں ان سب کے جسم تو مادی ہیں پھر ان مادی اجسام میں حرکت اور جان کیسے پیدا ہو جاتی ہے تو اس پر وہ جواب دیتے ہیں کہ یہ سب مادے کی فطری اور جبلّی خاصیتیں ہیں۔ اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ انسان کا جسم بھی تو مادی ہے پھر اس میں روح، عقل، نفس اور جذبات وغیرہ جو قطعاً غیر مادی ہیں کس طرح پیدا ہو جاتے ہیں تو اس کا بھی وہ یہی

جواب دیتے ہیں کہ یہ سب بھی مادے کی خاصیتیں ہیں ۔اب بتائیے کہ معترض اس سے آگے اور کیا کہے، مجبوراُ وہ خاموش ہوجاتا ہے حالانکہ اس کی تسلی نہیں ہوتی ۔مختصر یہ کہ مادہ پرستوں کے نظریئے کے مطابق ''یہ ساری کائنات ایک وجود ہے جو مادہ ہے اور اس میں جو تغیر و تبدّل اور حرکت ہے وہ مادہ کی صفت یا جبلّت ہے ۔''

2 ۔اب جواب نمبر دو کو پڑھیئے ،اس نظریئے کی رو سے وجود تین ہیں جو ازلی و ابدی ہیں ۔ایک مادہ دوسری روح تیسرا خدا ۔مادہ کا خاصہ ہے کہ وہ ہر صورت شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے ۔روح کا خاصہ ہے کہ وہ مادہ میں حلول کرجاتی ہے اور اس کو متحرک کردیتی ہے اور تمام اعمال و افعال روح ہی سے سرزد ہوتے اور تکلیف و راحت اور مسرت و الم کا احساس بھی روح ہی کو ہوتا ہے ۔خدا کا کام یہ ہے کہ وہ اعمال کی جزا و سزا کے ایک خاص قانون کے مطابق روحوں کو مختلف مادی اجسام بنا کر ان میں ڈالتا رہتا ہے ۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مفکرین نے یہ نظریہ کس طرح قائم کیا تو معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ویدوں میں جو توحید کی تعلیم ہے اس کی وجہ سے ان کے ذہن میں خدا کا ایک تصور پہلے ہی سے موجود تھا لیکن ان کی سمجھ میں یہ نہ آتا تھا کہ ''جب خدا کے سوا اور کچھ موجود ہی نہ تھا تو خدا نے یہ مخلوق کس طرح پیدا کردی'' ان کے علم میں سب سے بڑی مثال انسان ہی کی تھی جو ہزاروں چیزوں کا خالق ہے اور وہ خدا کی صفات کو بھی انسان ہی کی صفات جیسا خیال کرتے تھے لیکن انسان اس وقت تک کوئی چیز نہیں بنا سکتا جب تک کہ اس کا سامان پہلے سے موجود نہ ہو اس لیے ان کی عقل یہ سوچنے سے عاجز تھی کہ جس وقت صرف خدا ہی موجود اور مادہ معدوم محض تھا تو خدا نے مادہ کو پیدا کس طرح کیا ۔وہ کہتے تھے کہ یہ تو ممکن ہے کہ ایک چیز موجود ہو اور اس کو ہزاروں بلکہ لاتعداد شکلوں میں تبدیل کرلیا جائے لیکن جب کوئی چیز سرے سے موجود ہی نہ ہو تو وہ کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے خواہ اس کا پیدا کرنے والا خدا ہی کیوں نہ ہو اس لیے انہیں ماننا پڑا کہ مادہ بھی

خدا کی طرح ازلی وابدی ہے۔اس کے ساتھ ہی ان کو خیال آیا کہ مادہ تو ایک جامد شے ہے اور جانداروں کے جسم بھی مادی ہیں تو وہ حرکت کیوں کرتے ہیں؟ ان کی عقل نے بتایا کہ مادے کے علاوہ دوسرا وجود صرف خدا کا ہے اس لیے خدا ہی ان اجسام کو حرکت دیتا ہے اور وہی ان اجسام میں موجود ہوتا ہے۔لیکن جب انہوں نے انسان کی ساخت اور صفات واعمال پر نظر کی تو انہوں نے دیکھا کہ انسان تو بے شمار بدیاں اور برائیاں بھی کرتا ہے حالانکہ خدا کو تو صرف نیکیوں اور خوبیوں کا حامل ہونا چاہئے،اس سے کوئی برائی سرزد ہی نہیں ہونی چاہئے تو ان کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔اب پھر وہی سوال پیدا ہوا کہ خدا نہیں تو پھر وہ کون سی شے ہے جو مادی اجسام میں داخل ہو کر ان کو حرکت دیتی اور برے یا بھلے اعمال کا ارتکاب کرتی ہے۔کافی غور وخوض کے بعد یہی سمجھ میں آیا کہ وہ کوئی اور شے ہے اور اس شے کا نام انہوں نے روح رکھا۔اس طرح یہ نظریہ وجود میں آیا کہ خدا،روح اور مادہ تینوں ازلی وابدی ہیں۔روح سے نیک وبد اعمال سرزد ہوتے ہیں،خدا ان اعمال کی جزا وسزا میں مادے کے مختلف اچھے یا برے جسم بنا کر روحوں کو اس میں ڈال دیتا ہے۔ اسی عقیدے کو تناسخ یا آواگون کہتے ہیں۔

3۔اب تیسرے جواب کو پڑھئے۔گمان غالب یہ ہے کہ ان مفکرین نے بھی مادی اجسام کی بالارادہ حرکت اور انسان کے فعال ہونے کی صفت سے خدا کی ہستی پر استدلال کیا ہے۔لیکن ان کی نظر زیادہ تر اس قانون فطرت پر ہے جس کے مطابق یہ نظام کائنات کام کر رہا ہے۔انہوں نے دیکھا کہ مٹی،آگ،ہوا اور پانی اپنے طبعی خواص کے خلاف کبھی کام نہیں کرتے۔سورج،چاند،ستارے اور سیارے ہمیشہ مقررہ مقامات سے مقررہ اوقات پر نکلتے اور غروب ہوتے ہیں۔زمین اپنے محور اور مدار پر ہمیشہ مقررہ وقت میں پورا چکر لگاتی ہے۔رات اور دن ایک مقررہ قاعدے کے مطابق گھٹتے اور بڑھتے ہیں۔بارش برسانے والی ہوائیں مقررہ اوقات پر اور مقررہ سمتوں سے چلتی اور موسم ایک خاص قاعدے کے مطابق مقررہ اوقات پر تبدیل ہوتے ہیں۔الغرض جتنا

زیادہ غور کیا یہی نظر آیا کہ کائنات کا ذرہ ذرہ ایک خاص قانون اور قاعدے کا پابند ہے اور اس پابندی میں کبھی بال برابر بھی فرق نہیں آتا تو لامحالہ انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس تمام نظام کے پیچھے کوئی خاص طاقت ہے جو اسے ایک خاص قانون کے مطابق چلا رہی ہے اسی طاقت کو انہوں نے واجب الوجود یا خدا مان لیا لیکن ان کے حواس اور دماغ پر یہ قانونِ فطرت کچھ اس طرح چھا گیا تھا کہ انہوں نے اس واجب الوجود کو بھی ایک قانون کا پابند اور ایک مشینی خدا سمجھ لیا اور اس طرح ان کا نظریہ ظہور میں آیا۔

4۔اب چوتھے جواب پر غور فرمایئے ان مفکرین نے بھی کسی نہ کسی وجہ سے خدا کے وجود کو تسلیم کر لیا اور یہ بھی مان لیا کہ وہ اس تمام کائنات کا خالق ہے۔لیکن جب انہوں نے انسان کو بدی اور ظلم کرتے دیکھا تو انہوں نے سوچا کہ خدا تو مجسم خوبی و نیکی ہے اور وہ اپنے بندوں کو بھی نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے،تو پھر یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے کہ وہی انسان میں بدی کی طاقت بھی پیدا کرے اور اس کو بدی کرنے کی رغبت دلائے ،اس لیے انہوں نے نتیجہ نکالا کہ یقیناً ایک خدا اور بھی ہے جس نے بدی پیدا کی ہے اور انسان کو بدی پر اکساتا ہے۔نیکی کے خدا کا نام انہوں نے یزداں رکھا اور بدی کے خدا کو اہرمن کے نام سے پکارا۔اس طرح ان کا نظریہ ظہور میں آیا۔

5۔اب پانچویں جواب کو دیکھئے۔یہ لوگ ایک خدا کو مانتے ہیں اور تقریباً اس طرح مانتے ہیں جس طرح الہامی مذاہب کے پیرو،مگر مخلوق کے ساتھ خدا کا جو تعلق اور رابطہ ہے اس کے متعلق ان مفکرین میں کافی اختلافات ہیں۔کوئی کہتا ہے کہ خدا کا مستقر عرش پر ہے اور وہ وہیں سے اپنے علم و طاقت اور فرشتوں کے ذریعے تمام نظامِ عالم کو کنٹرول کرتا ہے۔کوئی کہتا ہے کہ خدا کائنات کے ہر ذرہ میں موجود ہے اور اسی لیے حاضر و ناظر ہے۔کوئی کہتا ہے کہ خدا کا علم اس کی ذات کے ساتھ قدیم ہے اور جو کچھ اس کائنات میں اب تک پیدا ہو چکا ہے یا آئندہ ہوگا وہ سب کچھ خدا نے اپنے علم کے مطابق پیدا کیا ہے اور آئندہ بھی کرے گا۔کوئی کہتا ہے کہ خدا کا علم قدیم نہیں بلکہ

اس کے علم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔وہ تجربہ کے طور پر طرح طرح کی مخلوق پیدا کرتا ہے اوراس میں جو نقص دیکھتا ہے ان کو دور کرکے طریقہ تخلیق کو بہتر سے بہتر بناتا رہتا ہے۔جب تک اس کی تخلیق مکمل نہ ہوگی وہ یونہی کرتا رہے گا،اسی کو قانون ارتقاء کہتے ہیں۔کوئی کہتا ہے کہ خدا ایک ذہن کُل ہے،یہی واجب الوجود ہے،یہ ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا۔اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ اسی ذہن کُل کے تصورات ہیں اور مخلوق کہلاتے ہیں،الغرض جتنے منہ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں،اپنی اپنی عقل اور علم کے مطابق جتنا اور جو کچھ بھی کوئی سمجھا ہے وہی اس نے کہہ دیا ہے اوراس کو وہ درست جانتا ہے۔

مندرجہ بالا پانچ جواب مفکرین کے ہیں،ہم نے ان کی بہت تھوڑی سی تصریح کی ہے۔ہمارا مقصد اس تصریح سے صرف یہ ہے کہ ناظرین کو معلوم ہوجائے کہ تخلیق کائنات کے متعلق انسانی عقل کس کس زاویے سے سوچتی اوراس کا فکر کس کس انداز سے پرواز کرتا ہے۔مگر حق یہ ہے کہ عقل اس گتھی کو مطلق نہیں سلجھا سکتی۔حافظ شیرازیؒ نے سچ کہا ہے کہ ؎

کس نکشود ونکشاید بہ حکمت ایں معمارا

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عقل کے بس کی بات نہیں۔راز حقیقت کی نقاب کشائی تو صرف عشق ووجدان ہی سے ہوسکتی ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ معما عشق ووجدان سے بھی پوری طرح حل نہیں ہوتا۔یہ درست ہے کہ جس مقام پر عقل ؎

اگر یک سرِموئی برتر پرم
فروغ تجلّی بسوزد پرم

کہہ کر گر پڑتی ہے،عشق ووجدان سالک کو وہاں سے اربوں کھربوں گنا فاصلہ پر حریم کبریا کے آستاں تک پہنچا دیتے ہیں لیکن سراپردۂ حرم کے اندر کیا ہے،نہ کوئی آج تک جان سکا نہ آئندہ جان اور بتا سکے گا۔یہ الگ بات ہے کہ کوئی ولی یا عارف کسی اونچے مقام تک پہنچ کر سراب کو حقیقت سمجھ بیٹھے اور اسے سیدھے نعرے لگانے اور دعوے کرنے

لگے۔اب اگر یہ نعرے اور دعوے قرآن اور احادیث کے خلاف ہوں تو آپ ہی بتایئے کہ کوئی مسلمان ان دعووں کو کس طرح درست اور صحیح مان سکتا ہے۔ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ کوئی ولی یا عارف کتنا ہی بلند مرتبہ کیوں نہ ہو، رسول اکرمؐ کے صحابہ کبارؓ کی برابری کسی لحاظ سے بھی نہیں کرسکتا۔حضرت ابوبکرؓ کا قول ہے کہ "عارف وہ ہے جس کو عرفان میں اپنے عجز کا اعتراف ہو"۔خود نبی کریمؐ کا ارشاد ہے **مَاعَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ** "یعنی خدا کو جاننے کا جو حق ہے اتنا تو میں بھی نہ جان سکا" اب آپ خود فیصلہ کرلیں کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس کو حقیقت کا پورا علم حاصل ہوگیا ہے تو ہم بحیثیت ایک مسلمان اس کے دعوے کو کیونکر درست تسلیم کرسکتے ہیں۔

6۔اب چھٹے جواب پر نظر کیجئے۔یہ جواب کسی فلسفی، حکیم یا عالم علم کلام کے فکر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر وحی کیا گیا اور ان کے توسّل سے ہم تک پہنچا ہے۔ہم چونکہ مسلمان ہیں اور یہ کتاب مسلمانوں ہی کے لیے لکھی گئی ہے اس لئے اس سوال کا جو جواب قرآن حکیم میں ہے ہم وہی تحریر کریں گے۔

قرآن میں ایک دو نہیں، دس پانچ نہیں، بیسیوں آیتیں ایسی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے اس زمین و آسمان کو پیدا کیا، ہم نے انسان اور جنات کو پیدا کیا، زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ بھی ہے سب کو ہم نے پیدا کیا وغیرہ وغیرہ۔

سورۂ رعد میں ارشاد ہوتا ہے۔**قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَالْوَاحِدُالْقَهَّار** o "کہہ دیجئے کہ اللہ ہی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے (اور وہ ہر لحاظ سے) واحد ہے اور سب پر غالب ہے" یہی نہیں بلکہ سورۂ الصّٰفّٰت میں یہاں تک کہہ دیا کہ **وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ** o (یعنی اللہ نے تم کو پیدا کیا اور ان تمام چیزوں کو بھی جو تم بناتے ہو) ان تمام آیتوں کی موجودگی میں ایک مسلمان اس کے سوائے اور کیا نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ اللہ کے سوائے اور جو کچھ بھی موجود ہے وہ سب اللہ ہی نے پیدا کیا ہے اور عدم محض سے پیدا کیا ہے اس لیے اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ

کائنات میں ایک وجود نہیں بلکہ دو وجود ہیں ایک خالق یعنی اللہ کا، دوسرا مخلوق یعنی ماسوائے اللہ جو کچھ بھی موجود ہے اس کا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مخلوق کا وجود حادث ہے یعنی وہ پیدا کی گئی ہے لیکن فنا ہو جائے گی اور اللہ اس کو پھر دوبارہ پیدا کرے گا۔ لیکن اللہ کا وجود قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ اپنی مخلوق پر ہر لحاظ سے قادر اور مختار ہے۔ اس نے مخلوق کو بغیر کسی کے مشورے کے اپنی مرضی سے جیسا چاہا ویسا بنایا، جیسا چاہتا ہے ویسے ہی رکھتا ہے۔ بناتا ہے، بگاڑتا ہے، عزت اور دولت دیتا ہے، ذلت اور غربت دیتا ہے، جب چاہے بیمار کر ڈالتا ہے، جب چاہے صحت عطا فرماتا ہے، ان باتوں کیلئے یا اور باتوں کیلئے وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے علاوہ ازیں وہ ذات وصفات میں ہر لحاظ سے بے مثل ہے اور چونکہ اس کی کوئی مثال موجود نہیں اس لیے اس کا عقل وفہم میں آنا محال ہے۔

الغرض یہ ہے قرآن کا جواب جس پر نبی کریمؐ کے زمانہ سے آج تک اربوں مسلمانوں کا ایمان رہا ہے اور اب بھی ہے۔ ان مسلمانوں کو نہ تو کبھی اس جواب کے درست ہونے پر کوئی شک ہوا نہ اس عقیدے کے قبول کرنے میں کوئی دشواری پیش آئی۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں تمام انسان ایک جیسے نہیں ہوتے جس طرح ان کی صورتوں میں فرق ہے اسی طرح ان کی ذہنیت، عقل، علم اور سوچنے کے انداز ایک دوسرے سے کافی مختلف ہوتے ہیں چنانچہ ان ہی انسانوں اور مسلمانوں میں ایک جماعت عقلمندوں اور دانشوروں کی ایسی بھی ہے جو کہتی ہے کہ ہم کسی بات کو اس وقت تک نہیں مان سکتے جب تک وہ ہماری عقل میں نہ آجائے۔ ان کی عقل میں قرآن کی یہ بات نہیں آتی کہ جب صرف خدا ہی موجود تھا اور اس کے سوائے اور کچھ بھی موجود نہ تھا تو خدا نے یہ مخلوق عدم محض سے کس طرح پیدا کر دی۔

وہ کہتے ہیں کہ "یہ تو ممکن ہے کہ کسی صناع کے پاس محض ایک چیز موجود ہو تو وہ اس سے بیسیوں چیزیں بنا سکتا ہے"۔ مثلاً ایک سنگ تراش کے پاس صرف پتھر ہوں تو وہ ان

کوتراش کرطرح طرح کے بتوں، پرندوں اور چوپایوں وغیرہ کے مجسمے بنا سکتا ہے، یا کسی کے پاس دو چیزیں ہوں تو وہ ان دونوں کو ملا کر ہزاروں قسم کی چیزیں تیار کرسکتا ہے۔ مثلاً ایک کمہار کے پاس مٹی اور پانی ہو تو وہ ان سے ہزاروں قسم کے بت، کھلونے، برتن اور دوسری استعمال کی چیزیں بنا سکتا ہے اور اگر کسی کے پاس دو سے زیادہ چیزیں ہوں تو اس کا تو کہنا ہی کیا، وہ تو بے شمار اور ان گنت چیزیں بنا سکتا ہے۔ مثلاً ایک انجینئر ہر قسم کے مکانات، سڑکیں اور مشینیں وغیرہ بنا سکتا ہے، لیکن یہ کس طرح ممکن ہوسکتا ہے کہ "ایک صناع اپنی ذات (وصفات) سے بالکل اکیلا ہو اور اس کے پاس کوئی سامان بھی نہ ہو اور وہ کوئی چیز پیدا کردے، چاہے وہ صناع خود خدا ہی کیوں نہ ہو" اس لیے انہوں نے یہ نظریہ قائم کرلیا کہ جن اشیاء کو ہم مخلوق کہتے ہیں وہ مخلوق نہیں بلکہ خود خدا کی تجلیات و صفات ہیں اور یہ تجلیات اس کی ذات کی عین ہیں یعنی یہ بھی خدا ہی کا وجود ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ جس عقل نے ان کو یہ بتایا تھا کہ خدا بھی عدم محض سے کوئی چیز پیدا نہیں کرسکتا، اسی عقل نے ان کو یہ کیوں نہ سمجھایا کہ جب اس کی تجلیات اس کی ذات کی عین ہیں تو وہ ظہور میں آکر معدوم یا غائب کیوں ہوجاتی ہیں ان کو تو ذات کی طرح ہمیشہ موجود رہنا چاہئے۔ اگر وہ سورج ہی پر غور کرتے تو ان کی سمجھ میں یہ بات بآسانی آسکتی تھی، سورج ایک وجود یا ایک ذات ہے اور دھوپ اس کی صفت یا تجلی ہے۔ اب سورج آسمان کے کسی حصہ میں بھی ہو دھوپ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے نہ کبھی کم و بیش ہوتی ہے نہ معدوم یا غائب ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ زمین یا کسی دوسرے سیارے میں اس کی محوری گردش کی وجہ سے کہیں ظاہر ہو اور کہیں غائب۔ قصہ مختصر جس طرح ان عاقل و فرزانہ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ خدا عدم محض سے کسی چیز کو کیسے پیدا کرسکتا ہے۔ اسی طرح ہماری ناقص اور عاجز عقل میں ان لوگوں کی باتیں نہیں آتیں۔

اب اگر ایک مفکر کسی مسلمان سے کہے کہ اچھا اگر آپ ایک وجود کے نظریئے کو نہیں مانتے تو پھر آپ ہی بتائیں کہ جب خدا کے سوا اور کچھ نہ تھا تو خدا نے یہ کائنات

کیسے پیدا کردی،تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب یہی ہوگا کہ بھائی ہم تو ان قصوں میں پڑتے نہیں، ہم تو غیب پر ایمان لائے ہیں، جب قرآن میں سینکڑوں جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ اس زمین وآسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے وہ سب میں نے ہی پیدا کیا ہے اور عدم محض سے صرف ''کُن'' کہہ کر پیدا کیا ہے تو یقیناً ایسا ہی ہے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اس پر شک وشبہ اور بحث کر کے اپنا ایمان خراب کریں۔اب اگر اس سے بھی زیادہ آپ اور کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو سنیئے! کہ جب خدا کسی شے کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو وجود میں لانے کا ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ''ہو'' اور وہ ہو جاتی ہے یہ درست ہے کہ وہ ''کن'' کہتے ہی ایسی نہیں ہو جاتی جیسی کہ اس مادی دنیا میں معلوم یا محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے وجود کی ایک جامع شکل پیدا ہو جاتی ہے۔جیسے کہ ایک بڑ کے عالیشان درخت کا رائی برابر بیج، جس میں سارا درخت موجود ہوتا ہے جو بعد میں منازلِ ارتقاء یا بہ اصطلاحِ تصوف تنز لاتِ پنجگانہ طے کر کے پورا درخت بن جاتا ہے۔بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خدا کا ارادہ ہی مجسم ہو کر وہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔یہاں ایک چھوٹی سی بات گذارش کر دینی مناسب معلوم ہوتی ہے، آپ نے اکثر مداری کے تماشے تو دیکھے ہونگے وہ ایک بڑا سا خالی ٹوکرا زمین پر الٹا رکھ دیتا ہے اور کچھ دیر تک ڈگڈگی بجاتا اور کچھ منتر پڑھتا رہتا ہے، اس کے بعد وہ ٹوکرا اٹھاتا ہے تو وہاں ایک آم کا درخت نظر آتا ہے جس میں آم بھی لگے ہوتے ہیں، وہ یہ آم اکثر تماشائیوں کو کھلاتا بھی ہے پھر اس درخت پر ٹوکرا رکھ دیتا ہے ،اب جو اٹھاتا ہے تو درخت غائب،اب اتنا ہی سوچ لیجئے کہ جب ایک مداری آم کا درخت پیدا کر دیتا ہے تو کیا خدا محض ارادے سے کائنات کو پیدا نہیں کرسکتا۔فرق صرف اتنا ہے کہ مداری کی شعبدہ بازی محض نظر بندی اور خیالی تھی لیکن خدا کی تخلیق حقیقی اور قیامت تک رہنے والی ہے۔

۵

نظریۂ وحدتُ الوجود کا تنقیدی جائزہ

آیئے اب ساتویں جواب پر غور کریں یہ جواب ہے وحدت الوجود اور اس کے ماننے والوں کو وجودی کہتے ہیں۔ اسلام کو اس نظریئے سے متعارف کروانے والے حضرت محی الدین ابن عربی معروف بہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ ہیں تاہم یہ نظریہ شیخ اکبرؒ کی تخلیق یا دریافت نہیں ہے۔ یہ نظریہ تو خود اسلام کے وجود میں آنے سے ہزارہا سال پہلے ہندوؤں کے اپنشدوں میں موجود تھا، اور آج سے تقریبا پانچ ہزار سال پہلے کرشن نے جو ہندوؤں کے غالبا سب سے بڑے اوتار مانے جاتے ہیں، مہابھارت یعنی کورو اور پانڈوؤں کی جنگ کے زمانہ میں پانڈوؤں کو اس کا اپدیش دیا تھا جو آج بھی گیتا کے صفحات میں موجود ومحفوظ ہے۔ چونکہ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ میں یونانی، لاطینی اور سنسکرت کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہو چکا تھا اور حضرت ابن عربیؒ کے زمانہ میں وہ آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت شیخ اکبرؒ کو کسی ایسے اپنشد کا عربی ترجمہ کہیں سے مل گیا ہوگا جس میں مسئلہ وحدت الوجود پر بحث کی گئی تھی اور وہ چونکہ منطق و فلسفہ اور علم و ادب کے عالم متبحر تھے، انہوں نے اس مسئلہ پر خوب غور وخوض کیا، یہاں تک کہ وہ ان کے دل ودماغ میں رچ بس گیا۔ اب چونکہ وہ ایک بہت بلند مرتبہ ولی اللہ اور صوفی بھی تھے اس لیے جب وہ سلوک طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سالک کو وحدت الوجود کی کیفیت سے واسطہ پڑتا ہے اور وہاں ان پر وہی کچھ مشہود ومکشوف ہوا جس پر وہ پہلے سے یقین رکھتے تھے تو انہوں نے اس مقام کو سلوک کی آخری منزل اور کیفیتِ وحدت الوجود کو حقیقت سمجھ لیا اور عوام کے سامنے اسی کا اظہار فرمانے لگے۔ یہ مقام جہاں سالک کو وحدت الوجود کی کیفیت سے سابقہ پڑتا ہے، کیا ہے اور کہاں ہے، وہاں سالک کیا دیکھتا ہے اور کشف سے اس پر کیا کچھ کھلتا ہے۔ اس کا بیان ہم انشاءاللہ آگے مناسب موقع پر کریں گے۔ آیئے اب اصل جواب کی طرف رجوع کریں۔

سوال ہے کہ کیا یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی یا یہ پیدا کی گئی ہے اور فنا ہو جائے گی ۔ اگر یہ پیدا کی گئی ہے تو اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، کیسا ہے، کہاں ہے، اور اس کا اس کائنات سے کیا رابطہ اور تعلق ہے ۔

اب وجودیوں کا جواب یہ ہے کہ ''وجود ایک ہے اور وہی اللہ ہے ۔ کائنات میں جو اشیاء ہمارے حواسِ ظاہر و باطن سے متحقق و معلوم یا محسوس و مدرک ہوتی ہیں وہ اللہ کی ذات کی تجلیات ہیں اور ذات و تجلیات میں وہی تعلق ہوتا ہے جو موصوف و صفت میں ہوتا ہے اور یہ کہ ذات و صفات ایک دوسرے کی عین ہیں یعنی ایک ہی ہیں''۔

پچھلے صفحات میں یہی جواب ہم نے کسی قدر مختصر لکھا ہے اور اس کی تھوڑی سی تصریح بھی کر دی ہے ۔ یہاں مزید تصریح کی ضرورت نہیں ۔ یہاں تو ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پچھلے صفحات میں مادّہ پرستوں کا جو جواب تحریر کیا گیا ہے اس میں اور وجودیوں کے جواب میں مطلق کوئی فرق نہیں ہے ۔ مطلب یہ ہوا کہ وجودی بھی اس لحاظ سے مادّہ پرست ہیں، اب جوابات ملاحظہ ہوں ۔

(ا) مادّہ پرست کہتے ہیں (ا) وجود ایک ہے اور وہ مادّہ ہے جو قدیم ہے

وجودی کہتے ہیں (ا) وجود ایک ہے اور وہ اللہ ہے جو قدیم ہے

(ب) مادّہ پرست کہتے ہیں (۲) مادّہ میں جو حرکت، تغیر و تبدل اور صور و اشکال پائی جاتی ہیں وہ مادّہ کا طبعی خاصہ ہے ۔

وجودی کہتے ہیں

(۲) وجود میں جو حرکت، تغیر و تبدل اور صور و اشکال پائی جاتی ہیں وہ اللہ کی تجلیات ہیں ۔

اب اگر ہم اللہ کی جگہ مادہ اور تجلیات کی جگہ طبعی خاصہ کے الفاظ رکھ دیں تو دونوں کے جواب بالکل ایک ہیں، علاوہ ازیں چونکہ وجودی کائنات کو اللہ کا عین یعنی اللہ ہی مانتے ہیں ۔ اس لیے ان کے جواب کا یہ مطلب بھی ہوا کہ کائنات ہی ازلی و ابدی ہے یعنی قدیم ہے اور یہی مادّہ پرست بھی کہتے ہیں ۔

یہ نظریہ چونکہ اسلامی عقائد اور وحی کے خلاف ہے اس لیے علمائے شریعت نے بجا طور پر اس کے خلاف سخت قدم اٹھایا ۔ انہوں نے بے شمار تقریروں اور تحریروں میں اس کو رد کیا اور

اس کے خلاف بہت سی مبسوط کتابیں بھی لکھیں۔دوسری طرف بہت سے صوفی حضرات نے اس کی تائید میں بہت سے مضامین اور کتابیں تحریر کیں۔اس طرح بحث وتمحیص کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک بھی کلیۃً ختم نہیں ہو سکا۔اگرچہ پہلا سا زور شور اب نہیں ہے پھر بھی چھیڑ چھاڑ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔موافق لکھنے والوں میں جو بزرگ قابلِ ذکر ہیں ان میں سے بہ خوفِ طوالت صرف چند حضرات کے اسمائے گرامی دیئے جاتے ہیں جو یہ ہیں: علامہ جلال الدین سیوطیؒ ، شیخ فخر الدین رازیؒ ،مولانا جامیؒ ، مجدّ والدین فیروز آبادیؒ صاحب قاموس ،قطب الدین الحمویؒ ،صلاح الدین الصفدیؒ ، عبدالرزاق الکاشانیؒ وغیرہ وغیرہ مخالف لکھنے والوں میں سے چند ایک بزرگ یہ ہیں علامہ ابنِ تیمیہؒ ،ابنِ خلدونؒ ،علامہ ابنِ حجرؒ ،علامہ ذہبیؒ ،ابن المقریؒ ،ابراہیم البقاعیؒ اور امام ربانی حضرت مجدّد الف ثانیؒ وغیرہ۔

ان بزرگوں کے علاوہ متاخرین میں بہت سے حضرات نے اس نظریہ کے موافق اور مخالف لکھا ہے۔موافق لکھنے والوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے متبعین خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن شاہ صاحب نے دو ٹوک کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے شیخ اکبرؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اصل میں دونوں نظریئے ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ مخالف لکھنے والوں میں خواجہ ناصر عندلیبؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت میر دردؒ کا نام قابلِ ذکر ہیں۔ان دونوں حضرات نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی توضیح کو رد کر کے نظریہ وحدت الوجود کو باطل ثابت کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اپنے کشف و شہود کی بنا پر لکھا ہے،ان کے علاوہ اور کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔اس سارے قضیہ میں سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ حضرت ابنِ عربیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ ناصر و میر دردؒ کے سوائے جتنے بھی لکھنے والے ہیں خواہ موافق ہوں یا مخالف سب کے سب یا تو متکلمین ہیں یا متصوفین۔صوفی بھی ہیں لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے ذات بحت تک سلوک طے کر کے حقیقت کو خود اپنے کشف و شہود سے معلوم کیا ہو،صرف استدلال عقلی و منطقی سے لکھا ہے جو کچھ لکھا ہے اور یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں

کہ ''اگر زیرِ تحقیق شے ایسی ہو جو نہ تو حواس ظاہری سے معلوم و تحقق ہو سکے، نہ عقل میں آ سکے، نہ انسان کا علم اس کو محیط ہو سکے تو ایسی صورت میں محض استدلال عقلی سے جو کچھ معلوم ہوگا صرف انسانی تخیل اور تفکر کی تخلیق ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی تائید میں عقلی اور علمی دلائل بھی موجود ہوں اور انسانی ذہن منطقی استدلال کی بنا پر اسے ماننے پر مجبور بھی ہو جائے پھر بھی پورے وثوق اور یقین سے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ تحقیق سو فیصدی درست ہے۔'' یہ بات مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق پر حرفاً حرفاً صادق آتی ہے۔ یہاں زیرِ تحقیق شے اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو نہ حواس ظاہری سے معلوم و محسوس ہو سکتی ہے نہ عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے نہ علم سے اس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ دریں صورت محض عقلی استدلال سے اس کی بابت جو کچھ ثابت کیا جائے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سو فیصد درست ہے۔ بعض معترضین تو اس بارے میں یہاں تک کہہ گزرے ہیں کہ جس شخص کو خود کشف و شہود نہ ہوتا ہو اس کو یہ حق ہی نہیں کہ وحدت الوجود یا ایسے دوسرے مسائل پر کچھ کہے لیکن یہ ان معترضین کی زیادتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم اور عقل انسان کو دیا ہی اس لیے ہے کہ ان دونوں کی مدد سے جو کچھ سمجھ میں آئے بے خوف و خطر بیان کرے۔ لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کے مخالفین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان کی تحقیق پر تنقید و اعتراض کریں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ زیرِ تحقیق اس چھان بین کی وجہ سے صاف ہوتا چلا جاتا ہے اور ذہن انسانی کی ترقی رکنے نہیں پاتی۔ عقلی مسائل تو رہے ایک طرف، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بزرگ اپنے کشف و شہود کی بناء پر کوئی بات کہتا ہے تو ہر صاحب علم اور صاحب نظر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس پر تنقید کرے اور اس کو خوب پرکھے اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس سے یہ نقص پیدا ہوگا کہ اگر کوئی شخص اپنے کشف و شہود کی بنا پر کوئی ایسی بات کہے جو وحی یعنی قرآن کے صریحاً خلاف ہو تو علمائے شریعت محض اس وجہ سے کہ ان کو کشف و شہود کی سعادت حاصل نہیں ہے اس شخص کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے اور مسلمانوں میں کفر و الحاد کے پھیلنے کو نہ روک سکیں گے۔ دیکھئے کشف و شہود بھی ہمیشہ درست نہیں ہوا کرتا اس میں بھی کبھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے اور غلطی نہیں تو غلط فہمیاں تو کثرت سے ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ کسی شخص کے کشف و شہود کی صرف اس بات کو صحیح سمجھیں جو وحی کے خلاف نہ ہو۔

لطیفہ

ایک ہمارے چشتیہ خاندان کے پیر بھائی تھے جو صوفی جی کے نام سے مشہور تھے، اکثر میرے پاس تشریف لاتے تھے، وہ صاحب اجازت تھے اور ان کے بہت سے مرید بھی تھے، ایک دن میرے پاس آئے تو میں گھر سے باہر درخت کے نیچے بیٹھا تھا وہ بھی وہیں بیٹھ گئے ۔ کچھ دیر بعد چائے آئی اور ہم چائے پینے لگے ۔ چائے پیتے پیتے صوفی جی کے چہرے پر کیفیت کے آثار نمایاں ہوئے، چہرہ سرخ ہو گیا، آنکھوں میں لال لال ڈورے ابھر آئے ۔ پھر کچھ نشہ کی سی حالت طاری ہوئی، یکا یک صوفی جی نے سر اُٹھایا اور مجھ سے کہنے لگے بھائی جان، میں نے کہا فرمایئے، کہنے لگے "میں خدا ہوں" اس پر میں نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اس کے دو ٹکڑے کر کے صوفی جی کو دیتے ہوئے کہا، لیجئے میں تو ایک حقیر بندہ ہوں، یہ تنکا خدا نے پیدا کیا تھا میں نے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں، آپ خدا ہیں اس کو جوڑ دیجئے صوفی جی نے دونوں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو آپس میں ملا کر ان پر توجہ فرمائی لیکن کیا بنتا تھا، ساتھ ہی ان کی وہ کیفیت بھی غائب ہو گئی جس کی وجہ سے وہ خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے ۔

ناظرین کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کی کیفیتیں صرف اس وقت تک قائم رہتی ہیں جب تک انسان اسی طرح ساکت و صامت بیٹھا رہے جس حالت میں کیفیت شروع ہو تے وقت تھا ۔ اگر وہ ذرا ہلے جلے یا اپنی نظر کسی اور طرف پھیرے یا کسی وجہ سے خیال کہیں اور ہٹ جائے تو کیفیت بھی فوراً ختم ہو جاتی ہے ۔ یہی حال صوفی جی کا ہوا، تنکے کو جوڑنے کے لیے جو خیال ہٹا، کیفیت ختم ہو گئی ۔

اس پر صوفی جی کہنے لگے، پھر آخر یہ سب کچھ کیا ہے ۔ میں نے پوچھا کیا؟ بولے کہ یہی وحدت الوجود ۔ میرے خیال میں تو یہ سب ایک کیفیت ہے، حقیقت نہیں ہے ۔ میں نے کہا اب آپ نے پتہ کی بات کہی، واقعی وحدت الوجود ایک بہت بڑی کیفیت ہے

حقیقت نہیں ہے ۔صوفی جی نے کہا تو کیا حضرت ابن عربیؒ جیسے عظیم الشان بزرگ نے بھی غلطی کی ہے ۔میں نے جواب دیا کہ حضرت ابن عربی نبی تو نہیں تھے ولی ہی تھے اور اولیاء سے غلطی کا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ۔لیکن میرے خیال میں حق یہ ہے کہ حضرت ابن عربیؒ نے غلطی نہیں کی بلکہ ان کو غلط فہمی ہوئی جیسی کہ ابھی آپ کو اپنے بارے میں ہو گئی تھی ۔فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی کیفیت صرف چند لمحوں کے لیے تھی اس لیے غلط فہمی بھی چند لمحے رہی ۔لیکن حضرت ابن عربیؒ چونکہ اپنے سلوک کے اختتام پر آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے اس لیے ان کی غلط فہمی دور نہ ہوئی ۔

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اگر آپ نے غور سے پڑھا ہے تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ نعوذ باللہ ہم جناب محی الدین ابن عربیؒ کی علمیّت یا روحانی بزرگی کے منکر نہیں ہیں ۔ ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سلوک کے اعلیٰ ترین مقامات پر پہنچنے کے بعد چونکہ سالک کو ایسی چیزیں مکشوف و مشہود ہوتی ہیں جن کی کوئی صورت و شکل نہیں ہوتی اور جن کی مثال بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہے اس لیے کسی سالک کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں اور ظاہر ہے کہ غلط فہمی پر اللہ تعالیٰ مواخذہ نہ فرمائیگا ۔ایسا ہی واقعہ خود ہمارے شیخ حضرت مولانا کریم الدین احمدؒ کے ساتھ بھی پیش آیا ۔مولانا کو جس وقت روح کا مشاہدہ ہوا تو وہ غلطی سے اس کو ذات باری تعالیٰ سمجھے اور عرصہ تک اسی کو سجدے کرتے رہے حتیٰ کہ ایک دفعہ جب وہ جنگل میں بہ کیفیت جذب پھر رہے تھے ایک فقیر ان کو ملا اور اس غلطی پر متنبہ کر کے اس بھنور سے نکال دیا ۔خود ہمارے اپنے ساتھ بھی یہی ہوا کہ جب ہم ھو طے کر کے عدم میں پہنچے تو چونکہ وہاں نہ کچھ محسوس و مدرک ہوتا ہے ،نہ دکھائی دیتا ہے اس لیے اس کو ذات بحت سمجھ لیا اور کافی عرصہ تک یہی غلط فہمی رہی یہاں تک کہ ایک مجذوب بزرگ نے اس غلطی سے آگاہ کیا اور عدم طے کرا دیا ۔ہم تو چیز ہی کیا ہیں بڑے بڑے بزرگوں نے معمولی معمولی کوائف میں ٹھوکریں کھائی ہیں ۔حضرت منصور علیہ الرحمۃ کے ساتھ بھی یہی ہوا ۔امر واقعہ یہ ہے کہ آج تک کسی بزرگ نے منصور

علیہ الرحمۃ کے دعوے **اَنَاالْحق** کی تحقیق نہیں کی۔ ہمارے خیال میں حضرت منصورؒ کو بھی غلط فہمی ہوئی تھی۔ تو جیہہ اس کی یہ ہے۔

یہ بات ہر صوفی اور متصوف اچھی طرح جانتا ہے کہ سلوک میں جذب کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے۔ جذب کے بغیر سلوک طے نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ جذب میں ایسا سرور، کیف و نشہ اور سرخوشی و سرمستی ہوتی ہے جس کی لذت میں رنج و غم، تکلیف و صعوبت اور دنیوی علائق و تعلقات کی مزاحمت کا کوئی اثر سالک کے دل و دماغ پر نہیں ہونے پاتا اور وہ اطمینان و سکون کے ساتھ مراحل و منازل سلوک طے کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن سالک تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جن کا ظرف اتنا بڑا ہوتا ہے کہ خواہ کتنی ہی قوت جذب پیدا ہو ان کی طبیعت اور عقل پر غالب نہیں ہو سکتی۔ دوسرے وہ لوگ کہ معمولی سا جذب بھی پیدا ہو جائے تو ان کی عقل و طبیعت مغلوب ہو جاتی ہے اور وہ سُکر میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تیسرے وہ لوگ جو پہلی دو جماعتوں کے بین بین ہیں۔

اُولوالعزم اور عالی ظرف حضرات کی پہلی جماعت مشتمل ہے خود نبی کریم ﷺ، آپ کے صحابہ کبارؓ اور بہت سے تابعینؒ پر۔ دوسری جماعت میں کچھ تابعین اور باقی تبع تابعین حضرات ہیں۔ ان کے بعد جو لوگ ہیں وہ تیسری جماعت میں ہیں۔ مگر ان میں بھی بعض بعض ایسے ہوتے ہیں جن پر جذب کا غلبہ بالکل نہیں ہوتا یا بہت معمولی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور اکرم ﷺ میں قوت جذب جتنی زیادہ تھی اتنی نہ تو پہلے کسی میں تھی نہ بعد میں ہوگی۔ مگر باوجود از یں حضور ﷺ سے اس جذب کا ظہور ساری عمر میں صرف ایک مرتبہ جنگ بدر میں اس موقع پر ہوا جب حضور ﷺ نے مٹھی بھر خاک دشمنوں کی طرف پھینکی، اس کے علاوہ حضور ﷺ سے کبھی کوئی بات ایسی ظہور میں نہیں آئی جس کو جذب کا اثر کہا جا سکے اور یہ کیفیت بھی چند سیکنڈ کے لیے اس طرح ظہور پذیر ہوئی کہ نہ کسی نے دیکھا، نہ کوئی سمجھا۔ حضرت عمرؓ سے صرف دو مرتبہ جذب کا ظہور رہوا۔ ایک اس وقت جب کہ آپ نے مسجد نبوی میں بیٹھے بیٹھے یا ساریۃُ الجبل (اے ساریہ پہاڑ کی

طرف) کہا جب کہ ساریہؓ میدان یرموک میں جنگ کر رہے تھے۔ دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ آپ نے دریائے نیل کو خط لکھا۔ حضرت علیؓ اکثر حالتِ جذب میں رہتے تھے لیکن آپ کو بھی سُکر کبھی نہیں ہوا۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ حضرت حسین ابنِ منصور حلاجؒ سے پہلے جذب کا غلبہ کبھی اس قدر شدت سے کسی پر نہیں ہوا جتنا کہ ان پر ہوا۔ جتنے بھی سالک ہیں اور ان کو جذب کا تجربہ ہوا ہے بخوبی جانتے ہیں کہ جس وقت جذب کی شدت ہوتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ بدن کے اندر کوئی دوسری روح یا طاقت حلول کر گئی ہے اور یہی وقت ہوتا ہے جب کہ سالک سے اضطراراً بے شمار کرامتیں سرزد ہوتی ہیں۔ وہ جو کچھ کہہ دیتا ہے ہو جاتا ہے، جو خیال کرتا ہے ظہور میں آجاتا ہے۔ یہی حضرت منصورؒ کے ساتھ ہوا۔ ان پر جس وقت جذب طاری ہوتا بے شمار لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور کرامات طلب کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ان سے جنت کے میوے منگواتے اور وہ دونوں آستینوں کو جھاڑتے تو ان میں سے سیب، انار اور انگور وغیرہ جھڑنے لگتے اور لوگ مزے لے لے کر کھاتے لیکن جس وقت جذب کی کیفیت نہ ہوتی صحو ہوتا تو اس وقت کوئی کرامت بھی سرزد نہ ہوتی تھی۔ اب چونکہ یہ ان کا پہلا تجربہ تھا اور متقدمین میں سے بھی کسی کی کوئی ایسی مثال موجود نہ تھی اس لیے لامحالہ قوتِ جذب کے متعلق ان کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اس وقت خود خدا ان کے اندر گھس جاتا ہے اور وہی یہ کرامات دکھاتا ہے۔ یہیں سے اُنہوں نے حلول کا مسئلہ اخذ کر لیا جو سراسر کفر و زندقہ ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ علمائے شریعت نے ان کے کفر اور قتل کا فتویٰ اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ جذب کے وقت بے خودی یا سُکر میں انا الحق کہتے تھے بلکہ اس لیے دیا تھا کہ جب وہ ہوش میں آجاتے اور صحو کی حالت میں ہوتے اس وقت بھی وہ یہی کہتے تھے کہ خدا بندے کے جسم میں حلول کر سکتا ہے ورنہ سُکر میں تو اکثر لوگوں نے ایسے کلمات کہے ہیں، علمائے شریعت نے کسی کے خلاف بھی فتویٰ نہیں دیا۔ خود حضرت بایزید بسطامیؒ نے کئی دفعہ سبحانی ما اعظم شانی کہا لیکن چونکہ یہ اعتراف کر لیا کہ ان کے منہ سے یہ کلمات بحالت سُکر نکلتے ہیں

اس لیے کسی نے بھی گرفت نہیں کی۔ الغرض اکثر سالکوں کو ایسی غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور حضرت منصورؒ کو بھی ایسی ہی غلط فہمی ہوئی۔

اب آپ خود ہی بتائیں کہ جب بڑے بڑے بزرگوں کو ایسی غلط فہمیاں ہوتی ہیں تو بیچارے عوام کالانعام کا تو ذکر ہی کیا، چنانچہ جب نظریہ وحدت الوجود کا ذکر خاصان خدا کے طبقہ سے نکل کر معمولی پیروں تک پہنچا اور انہوں نے اپنے جاہل مریدوں کے سامنے بڑے رازدارانہ انداز میں بیان کیا تو ہر طرف آگ سی لگ گئی۔ اکثر طبائع تو ویسے ہی بغاوت پر مائل شرعی اور اخلاقی پابندیوں سے گریزاں اور مادر پدر آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتی ہیں۔ ان کے کان میں جب یہ بھنک پڑی کہ "ارے ہم تو خدا ہیں" اور "باقی جو کچھ ہے یہ مولویوں نے ایسے ہی ڈھونگ رچا رکھا ہے" تو انہوں نے شرعی اور اخلاقی حدود و قیود کی زنجیریں توڑ کر پھینک دیں اور من مانی کرنے لگے خدا کا خوف، رسول کی محبت اور مذہب کا احترام دلوں سے اٹھ گیا کفر و الحاد کے زہریلے جراثیم معاشرے کے ایک بڑے طبقہ میں سرایت کر گئے۔

یہ باتیں پڑھ کر ممکن ہے کوئی کہے کہ یہ سب غلط ہے، ہم نے تو ایک آدمی بھی ایسا نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہو، نماز روزے سے منکر ہو اور حرام و حلال میں تمیز نہ کرتا ہو تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ سب کے سامنے تو ایسی باتیں نہیں کرتے۔ آپ ان کی خلوتوں میں ان کے ساتھ بیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں تو آپ کو یقیناً ہماری تائید کرنی پڑے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ معاشرے کی اکثریت مسلمان ہے اور وجودیوں کی ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتی اس لیے ان کو عام مسلمانوں کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ورنہ ابھی تک ایک دو آدمی تو کیا تصوف کے ایسے خانوادے موجود ہیں جو مریدوں کو علی الاعلان یہی تعلیم دیتے ہیں کہ نماز روزے کی ضرورت نہیں تم خود خدا ہو، کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ ناظرین میں سے اگر کسی کو کبھی کسی رسول شاہی پیر سے واسطہ پڑا ہو تو وہ یقیناً ہماری تائید کرے گا۔ علاوہ ازیں مغربی پاکستان کے شمال سے جنوب اور

مشرق سے مغرب تک سفر کر کے دیکھئے آپ کو اکثر دیہات اور قصبات میں ایسے لوگ ملیں گے جو بالکل برہنہ یا نیم برہنہ رہتے ہیں، چنڈو یا چرس وغیرہ پیتے ہیں، نماز روزے کے قریب بھی نہیں جاتے ۔ان کے پاس سینکڑوں آدمی روزانہ منتیں اور مرادیں لے کر آتے ہیں اور اپنا دین و ایمان لٹا کر واپس جاتے ہیں ۔ان سینکڑوں آدمیوں میں سے دو چار کی منتیں پوری بھی ہو جاتی ہیں البتہ ایک بات ایسی ہے جو عوام کو ان کا معتقد بنا دیتی ہے اور وہ ہے ان میں سے بعض بعض کا کشف اور کرامات ۔تصوف میں کشف و کرامات کا کیا درجہ ہے اور کشف و کرامت کن کن لوگوں سے سرزد ہو سکتی ہے ۔ یہاں اس کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ۔یہاں تو صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ لوگ جو بزرگ کہلاتے ہیں لیکن دین و ایمان اور خدا اور رسول سے بے نیاز ہو کر زندگی گذارتے ہیں وجودی ہی تو ہیں ۔

اب ہم چند ایسے اعتراضات قلمبند کرتے ہیں جو نظریہ وحدت الوجود پر عقلاً اور مذہباً وارد ہوتے ہیں ۔یہ سب اعتراض ایک ہی جگہ اکٹھے بھی بیان کئے جا سکتے تھے لیکن ہم ان کو الگ الگ بیان کرتے ہیں تا کہ قارئین کی نظر میں خاص طور پر نمایاں ہو جائیں ۔

1 ۔اگر اشیاء جن کو عام لوگ مخلوق کہتے ہیں ۔بقول وجودیوں کے خدا کی تجلیات اور اس کی ذات کا عین (یعنی خود خدا) ہیں تو ان اشیاء میں نقص کیوں ہوتے ہیں، حالانکہ خدا تو ہر لحاظ سے اکمل و مکمل اور نقص سے پاک ہے، مثال کے طور پر انسان کو لیجئے ، کیا کوئی انسان آج تک ایسا گذرا ہے یا اب موجود ہے جس میں کوئی نقص نہ ہو مثلاً کمزوری ، بیماری ، غربت ، بدصورتی ، بد اخلاقی ، بداطواری اور بدمزاجی وغیرہ ، یہی حال دوسری اشیاء کا ہے ۔کیا آپ کوئی ایسی شے پیش کر سکتے ہیں جس میں کوئی نقص نہ ہو ۔اگر نہیں کر سکتے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یا تو اشیا خدا کا عین نہیں غیر ہیں یا پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ سارے نقص خدا میں بھی موجود ہیں ۔

2 ۔اشیاء میں جو مسلسل تغیر و تبدل اور ترقی یا انحطاط پایا جاتا ہے تو کیا وہ خدا میں بھی

موجود ہے؟ انسان کا بچہ عدم سے وجود میں آتا ہے ۔بڑھنا شروع ہوتا ہے بڑی بڑی عمر پاتا ہے، پھر کہولت کا دور شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد انحطاط ہوتا ہے ۔وہ اتنا بدل جاتا ہے کہ جس وقت پیدا ہوا تھا اگر اس وقت ماں کی گود سے الگ کر لیا جائے اور پھر دیکھنے کا موقع نہ آئے تو دس، بیس، تیس، چالیس سال کی عمر کے بعد اس کی ماں بھی اس کو دیکھے تو ہرگز نہ پہچان سکے ۔یا اگر برس دو برس کی عمر میں اس کی تصویر اُتروائی جائے تو وہ خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکے گا ۔یہی حال دوسرے حیوانات اور نباتات کا ہے کہ وہ جیسے کچھ ابتدا میں ہوتے ہیں آخر میں نہیں رہتے ۔بڑ کے درخت کا رائی برابر بیج شروع میں ننھا سا پودا ہوتا ہے، بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور سینکڑوں برس کی عمر پاتا ہے ۔اس تغیر وتبدل کی کوئی حد ہے، کیا خدا کی ذات میں بھی یہی تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے اگر کہیں کہ نہیں ہوتا تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہ تغیر وتبدل اس کی تجلیات میں جو کہ اس کی عین ہیں، میں کیوں ہوتا ہے اور اگر یوں کہیں کہ ہوتا ہے تو ایسی ہستی جس میں اتنا تغیر و تبدل ہو، قدیم نہیں ہو سکتی ۔کیونکہ تبدیلی یا انحطاط کی انتہا فنا ہے اور خدا کو فنا نہیں ۔فنا تو کیا اس میں ذرا سا بھی تغیر نہیں جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے ۔

الآن کما کان ۔(وہ جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ہمیشہ ویسا ہی رہے گا) اس کے علاوہ وہ قرآن میں یہ بھی فرماتا ہے کہ **كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ٥ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامُ** ۔

(یعنی تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی صرف اللہ کی ذات باقی رہے گی)

اس آیت سے یہ بالکل قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ وجود دو ہیں ایک وہ جو فنا ہو جائے گا (اور یہ اشیاء کا وجود ہے جس کو وجودی اللہ کی ذات کی تجلیات کہتے ہیں) دوسرا وہ جو ہمیشہ باقی رہے گا اور یہ وجود اللہ کا ہے ۔

3 ۔اگر انسان اللہ کی تجلی یعنی خود خدا ہے تو وہ مجبور کیوں ہے مختار کیوں نہیں ۔ہر انسان کے دل میں سینکڑوں تمنائیں، آرزوئیں اور اُمنگیں ہوتی ہیں ان میں سے کتنی

پوری ہوتی ہیں ؟ جس کو دیکھو اپنی مجبوریوں کا دکھڑا روتا ہے، جس سے بات کرو اپنی حسرتوں اور مایوسیوں کے قصے سناتا ہے اور سرد آہیں بھرتا ہے۔ جو بھی ہے وہ اپنی آرزوئیں بر نہ آنے پر رنجیدہ اور پریشان ہے۔ سبحان اللہ! کیا خوب خدا ہے کہ جو چاہتا ہے نہیں کرسکتا۔ حالانکہ خدا تو کہتا ہے کہ میں جو کچھ کرنا چاہوں اس کا ارادہ کرتا ہوں اور کہتا ہوں "**کُن**" اور وہ ہو جاتا ہے۔

4۔ اگر انسان خدا ہے تو عبادت کی اس کو کیا ضرورت ہے۔ وہ مذہبی، معاشرتی اور معیشتی قوانین اور آداب وقواعد کی پابندی کیوں کرے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے لئے ان باتوں کی پابندی ضروری ہے تو وہ خدا نہیں، کیونکہ خدا تو معبود ہے عبد نہیں۔

5۔ اگر انسان خدا ہے تو وہ گناہ اور جرائم کی سزا کا مستوجب کیوں ہے۔ خدا تو ہر وقت ایسے کام کرتا ہے جو انسان کی نگاہ میں گناہ اور جرم ہیں مثلاً وہ لوگوں کو بیمار ڈالتا ہے، ان کا مال و دولت چھین کر مفلس بنا دیتا ہے، ان سے فاقے کرواتا ہے، ان کے بچوں کو مار ڈالتا ہے اور ایک سیکنڈ میں ہزاروں کروڑوں جانوروں کو مار دیتا ہے۔ اگر انسان خدا کی تجلی یعنی خود خدا ہے تو وہ بھی ایسا کیوں نہ کرے۔ اس کو چوری، قتل، زنا وغیرہ کی سزا کیوں دی جاتی ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی دولت چرا لیتا ہے یا اس کو قتل کر دیتا ہے تو کیا گناہ کرتا ہے۔ مقتول بھی خدا ہے اور قاتل بھی خدا ہے اور جج بن کر پھانسی کا حکم دینے والا بھی خدا ہے عجب فلسفہ ہے۔ اگر ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ غلط ہے تو پھر وجودی حضرات اس شعر کے کیا معنی لیتے ہیں۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ
خود برسرِ آں کوزہ خریدار برآمد

6۔ اگر انسان خدا ہے تو جاہل کیوں ہے۔ خدا کو تو اس کون و مکان میں جو کچھ ہے اس کے ایک ایک ذرہ کا ہر وقت علم ہے۔ سورہ یونس میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي

السَّمَاءِ (تمہارے رب سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں خواہ آسمان میں ہو یا زمین میں ہو)

اگر ہماری زمین یا کسی دوسرے سیارے میں سمندر کی تہ میں ایک جھینگے برابر کسی چھوٹے سے جاندار کو بھوک لگتی ہے تو خدا کو اس کا علم ہوتا ہے اور وہ اس کی غذا اس کو پہنچاتا ہے لیکن انسان؟ انسان کو تو اپنی پیٹھ پیچھے کی چیزوں کا بھی علم نہیں ہوتا اور پیٹھ پیچھے تو کیا، اس کے تو سامنے بھی جتنی چیزیں ہوتی ہیں ان میں سے بھی ہر ایک چیز اس کے دماغ میں حاضر نہیں ہوتی۔ اس کو تو صرف اس شے کا علم ہوتا ہے جس کو وہ خاص توجہ سے دیکھے۔ کوئی بتا سکتا ہے کہ خدا ہوتے ہوئے یہ بے خبری اور جہالت کیوں ہے؟

7۔ اگر وجودیوں کے نظریئے کے مطابق وہ تمام اشیاء جن کو ہم مخلوق کہتے ہیں۔ خدا کی تجلیات اور اس کی عین (یعنی خدا) ہیں تو پتھر بھی خدا ہے۔ پھر بت پرستی کیوں ناجائز ہے۔ بت پرستی کو مٹانے کیلئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر کیوں بھیجے گئے۔

ہمارے نبی کریم ﷺ نے اتنی تکلیف اور مصیبتیں اٹھا کر مکہ کو کیوں فتح کیا اور کعبۃ اللہ میں جو بت تھے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کیوں پھینکوا دیا۔ ہم کو تو اس بات کا کوئی جواب معلوم نہیں۔ وجودیوں کو شاید معلوم ہو۔

ناظرین! ذرا خدا لگتی کہئے گا کہ کسی اسلامی ملک کی ساری آبادی یا بھاری اکثریت اگر وحدت الوجود کو اپنا عقیدہ بنا لے تو یہ اس ملک کی تباہی و بربادی کا باعث ہو گا یا خوش حالی اور ترقی کا! اب ہم ان آیات کے معنی اور مطالب بیان کریں گے جو وجودی حضرات اپنے نظریہ کے ثبوت میں توڑ مروڑ کر پیش کیا کرتے ہیں۔

1۔ سب سے پہلے تو ان لوگوں نے کلمہ پر ہی ہاتھ صاف کیا اور اس کے معنی بدل دیئے۔ کلمہ کا پہلا جزو ہے **لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰه** اور اس کا سیدھا سا مطلب ہے کہ "نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ" یہ لوگ اِسکے معنی یوں کرتے ہیں کہ "نہیں ہے کوئی معبود (دنیا کے معبودوں میں) مگر وہ اللہ ہے" مطلب یہ کہ دنیا میں جو چیز بھی کہیں پوجی جاتی ہے وہی

اللہ ہے خواہ وہ پتھر ہو، شجر ہو، جانور ہو، لنگ ہو، یونی ہو، کچھ بھی ہو۔ اس دعوے کے ثبوت میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے۔ **انا عند ظن عبدی بی** (یعنی ہم اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہیں) وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی کسی پتھر کے متعلق یہ گمان کر لے کہ یہ خدا ہے تو وہ سچا ہے کیونکہ پتھر بھی تو خدا کی تجلی اور اس کا عین ہے مگر یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں ثقہ بزرگوں کے متعلق نہیں ہے، وہ نہ تو ایسا کہتے ہیں اور نہ ایسا کرتے ہیں۔ یہ تو ہم نے صرف جاہل پیروں کے ان جاہل مریدوں کے بارے میں کہا ہے جو اپنی مجلسوں میں اکٹھے ہو کر معرفت و حقیقت کے رازہائے درون پردہ بیان کرتے ہیں حالانکہ پڑھے لکھے خاک بھی نہیں ہوتے۔ اب سے کوئی چالیس سال پہلے ایسی ہی ایک مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا جو خرافات وہاں بکی گئیں اسکا ذکر کرنا تو فضول ہے لیکن یہ بات ضرور قابل ذکر ہے کہ ایک صاحب بڑے جوش سے فرمانے لگے کہ ”یہ دولت تو ہم فقیروں کا ہی ورثہ ہے مولویوں کو تو اس کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہ علم حضورﷺ نے صرف حضرت علیؓ کو سکھایا تھا اور انہی سے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک دن حضورﷺ یہی تعلیم حضرت علیؓ کو دے رہے تھے کہ حضرت عمرؓ آتے ہوئے دکھائی دیئے حضورﷺ نے فرمایا اب خاموش ہو جاؤ عمر آ رہا ہے“۔

میں تو یہ سن کر خاموش رہا، کیونکہ میں تو ایسی مجلسوں میں صرف سننے کے لیے جاتا تھا بولنے کے لئے نہیں۔ مگر بعد میں جب میں نے اس بات کی تحقیق کی تو جو کچھ معلوم ہوا وہ حضرت علیؓ کی اس حدیث سے ظاہر ہو جائے گا۔ نسائی نے ابوجحیفہ سے روایت کیا ہے کہ ہم نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس رسول اللہﷺ کی طرف سے بجز قرآن کے کچھ اور چیز بھی ہے؟ تو انہوں نے فرمایا نہیں۔ ”قسم ہے اس ذات کی جس نے دانہ کو شگافتہ کیا اور جان کو پیدا کیا، بجز اس کے کہ (حضورﷺ نے یہ فرمایا تھا) اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو اپنی کتاب کے متعلق (خاص) فہم عطا فرما دیتا ہے“ دیکھا آپ نے! اس طرح بنتا ہے رائی سے پہاڑ۔

2۔دوسری آیت ہے۔ **اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** اس آیت کی بابت کہا جاتا ہے کہ یہ نظریہ وحدت الوجود کی اساس و بنیاد ہے۔مگر ہمیں تو اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی ۔اس کے سیدھے سے معنی ہیں کہ اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔اس کا صرف یہی مطلب ہوسکتا ہے کہ زمین اور آسمانوں کا وجود جو ہم کو نظر آتا ہے محض اس لئے کہ یہ خدا کے نور سے روشن ہیں اور اللہ کا نور ان پر پرتو فگن ہے۔وجودی اس کا بھی یہی مطلب لیتے ہیں کہ یہ خود اللہ کا نور یا تجلیات ہیں، حالانکہ الفاظ سے یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں نکلتا۔عام محاورہ ہے کہ میرا بیٹا میرے گھر کا اجالا یا نور ہے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے کہ میرے گھر میں جو چہل پہل اور رونق (استعارۃً روشنی) نظر آتی ہے وہ میرے بیٹے ہی کی وجہ سے ہے یا کوئی یوں کہے کہ جناب آپ تو بڑے آدمی ہیں، بجلی کی روشنی آپ کے گھر کو منور کرتی ہے، میں تو غریب آدمی ہوں یہی مٹی کے تیل کا دیا ہی میرے گھر کا نور ہے، ساری رات اسی کی روشنی سے میرا گھر روشن رہتا ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ اشعار و فقرات ہوں یا آیات، ہر آدمی ان کا مطلب اپنے نظریہ اور علم کے مطابق نکالتا ہے جب پہلے ہی سے دماغ پر ایک نظریہ چھایا ہوا ہو تو ہر شے اسی کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔اگر اس آیت کے معنی کا نظارہ آنکھوں سے کرنا ہو تو مندرجہ ذیل مثال جو ہم اپنی کتاب "تعمیر ملت" سے نقل کر کے یہاں لکھتے ہیں، بغور مطالعہ فرمائیں کچھ نہ کچھ تو سمجھ میں آ ہی جائیگا۔

"ایک سینما ہال کا تصور کیجئے، ایک طرف آپریٹر روم ہے دوسری طرف پردہ سیمیں اور دونوں کے بیچ میں دو سو فٹ لمبا ہال، آپریٹر روم میں انجن اور مشینری وغیرہ ہے ایک چرخی پر فلم جڑی ہوئی ہے جس کے سامنے دیوار میں ایک سوراخ ہے۔آپریٹر فلم پر پیچھے سے روشنی ڈالتا ہے جو ایک تصویر پر پڑتی ہے اور تصویر روشنی کی شعاعوں پر سوار ہو کر ہال کے خلاء میں سے گذرتی اور پردہ پر زیادہ بڑی (کثیف) ہو کر نظر آنے لگتی ہے۔مثلاً اس فلم کو روح بسیط خیال کیجئے اور اس تصویر کو جو روشنی کے ذریعہ پردہ تک بھیجی گئی ہے، ایک

روح مجرد۔ پیچھے سے جو روشنی پڑ رہی ہے اس کو اللہ کا نور، ارادہ یا حکم۔ فلم کی سطح سے پردہ تک جو خلاء ہے اس کو عالم مثال اور خود پردہ کو عالم مادی۔ اب ہمارے ایک سوال کا جواب دیجئے: ۔فلم سے پردہ تک جو خلاء ہے کیا اس میں کوئی ذرہ بھی ایسا ہے جہاں وہ تصویر نہ ہو جو فلم پر بے جان اور پردہ پر متحرک (جاندار) نظر آرہی ہے اور یہ بھی بتایئے کہ فلم کی تصویر سے پردہ کی تصویر تک کوئی ذرہ بھر جگہ بھی ان شعاعوں میں ایسی ہے جہاں یہ تصویر موجود نہ ہو"۔ اس مثال پر غور کریں اور فلم پر جو روشنی ڈالی جا رہی ہے اس کو مثالاً اللہ کا نور فرض کرلیں تو آپ پر **اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** کا مطلب اچھی طرح واضح ہو جائے گا۔

3۔تیسری آیت ہے۔ **وَھُوَمَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ** (تم جہاں بھی ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے) سارا قرآن ایسی آیتوں سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ حاضر و ناظر ہے، ہر جگہ موجود ہے، تمہاری ہر بات سنتا اور ہر حرکت دیکھتا ہے۔ تم گھر میں ہو یا بازار میں، شہر میں ہو یا جنگل میں، سمندر کی تہہ میں ہو یا پہاڑ کی چوٹی پر اللہ ہر جگہ موجود اور تمہارے ساتھ ہے۔ وحدت الوجود کا ثبوت تو اس آیت سے کسی طرح بھی نہیں ملتا، یہ
ضرور ثابت ہوتا ہے کہ وجود دو ہیں، ایک اللہ کا اور دوسرا مخلوق کا، اللہ کا وجود اپنی مخلوق کے ساتھ ہر جگہ اور ہر وقت موجود رہتا ہے۔

4۔چوتھی آیت ہے **ھُوَالْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُوَالظَّاھِرُوَالْبَاطِنُ** یعنی وہی اول ہے، وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے، وہی باطن ہے۔ اس آیت کے معنی بھی وجودی حضرات یہی لیتے ہیں کہ وجود صرف ایک ہے اور وہی اللہ ہے۔ مگر انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہر اول متقاضی ہے کسی ایک چیز یا بہت سی چیزوں کے وجود کا جو اس کے بعد ہوں، اسی طرح آخر متقاضی ہے کسی ایک چیز یا بہت سی چیزوں کے وجود کا جو اس سے پہلے ہوں۔ بغیر اس کے اول و آخر کے الفاظ صادق ہی نہیں آتے۔ مثال کے طور پر ایک قطار میں بہت سی چیزیں رکھی ہیں تو اول اس کو کہیں گے جو ان میں سب سے پہلے ہو اور آخر

اسے کہیں گے جس کے بعد اور کوئی چیز نہ ہو۔لیکن اگر صرف ایک چیز رکھی ہو تو وہ نہ تو اول کہلا سکتی ہے نہ آخر،اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا وجود ہے جس کا اول بھی اللہ ہے اور آخر بھی اللہ ہے۔اور وہ دوسرا وجود مخلوق ہی کا ہے۔یہی بات لفظ ظاہر و باطن پر بھی صادق آتی ہے۔جب کوئی چیز موجود ہوگی تب ہی تو ہم کہیں گے کہ اس کا ظاہر تو بہت اچھا ہے لیکن باطن کا پتہ نہیں،اندر سے کیسی ہے۔جب صرف ایک ہی چیز ایسی موجود ہو جو مادی نہیں ہے تو اس کے ظاہر اور باطن کا ذکر ذہن میں بھی نہیں آ سکتا مثلاً آپ کے صحن میں دھوپ پھیلی ہوئی ہے تو کیا آپ کہیں گے کہ اس کا ظاہر یہ ہے اور باطن وہ۔خدا بھی ایک نور ہے جیسا کہ اوپر کی آیت **اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** میں بیان ہو چکا ہے تو اس کے لیے آپ ظاہر اور باطن کا لفظ کس طرح استعمال کر سکتے ہیں لہذا اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جتنی بھی مخلوق موجود ہے اس کے اول بھی اللہ ہے اور آخر بھی اللہ۔اس کے ظاہر میں بھی اللہ اور باطن میں بھی اللہ ہے۔یہ بات کہ اللہ ہر چیز کے ظاہر میں موجود ہے (گو وہ دکھائی نہیں دیتا) قرآن میں دوسری کئی جگہ پر ان الفاظ میں بتائی گئی ہے۔**وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْط** (اللہ ہر شے کو احاطہ کئے ہوئے ہے)بہر حال ان چاروں الفاظ کے لیے کسی دوسری شے کا ہونا ضروری ہے اور دوسری شے ہی مخلوق ہے۔دراصل وجودیوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اللہ ہر شے کے اندر بھی ہو،باہر بھی،اول بھی ہو،آخر بھی اور پھر بھی وہ ان اشیاء سے بالکل الگ ہو یہ ان کے عرفان کا قصور ہے ورنہ درحقیقت بات یہی ہے۔مگر مجبوری یہ ہے کہ یہ بات نہ تو کسی مثال سے ظاہر کی جا سکتی ہے نہ الفاظ میں ہی بیان ہو سکتی ہے،صرف مشاہدہ حق ہی سے سمجھ میں آتی ہے،پھر بھی ہم ایک بہت ہی نامکمل اور گھٹیا سی مثال دیتے ہیں شاید کسی کی سمجھ میں کچھ آ جائے۔تصور کیجئے کہ ایک بحرِ ذخار ہے ناپیدا کنار۔اس کے اندر ایک چھوٹا سا ٹکڑا اسفنج کا پڑا ہوا ہے۔اس اسفنج کے اول بھی پانی ہے اور آخر بھی پانی،باہر (ظاہر میں) بھی پانی اور اندر (باطن میں) بھی پانی اور پانی ہی اس کو چاروں طرف سے محیط بھی ہے

لیکن باوجود اس کے اسفنج، اسفنج ہے اور پانی، پانی ہے۔

5۔ قرآن میں ہے **وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ** (اور وہ تمہاری جانوں میں ہے پس کیا تم دیکھتے نہیں) اس آیت کو بھی وجودی اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جان جیسی غیر مادی چیز میں کوئی دوسری چیز اس طرح کیسے سما سکتی ہے کہ وہ اس کے اندر بھی ہو اور پھر اس سے الگ بھی، یعنی اپنا ایک الگ حقیقی وجود بھی رکھتی ہو۔ذیل میں ہم چند مثالیں لکھتے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد امید ہے کہ آپ سمجھ جائیں گے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔

1۔نباتات اور پانی

ایک ایسے درخت کو دیکھئے جس کا تنا خوب موٹا اور سخت ہو، پھر اس کے موٹے ٹہنوں ٹہنیوں، نرم شاخوں، پتوں اور پھولوں پر نظر کیجئے ۔اب سوچئے کہ اس سارے درخت میں کوئی جگہ ایسی بھی ہے جس میں پانی نہ ہو، آپ کی عقل بتائے گی کہ ایک انچ برابر جگہ بھی ایسی نہیں جہاں پانی نہ ہو، حتیٰ کہ نرم پتیوں اور پھولوں میں جو بال برابر باریک رگیں نظر آتی ہیں ان میں بھی پانی موجود ہے اگرچہ نظر نہیں آتا ۔اب بتائیے کہ کیا درخت اور پانی ایک ہی وجود ہیں، ہرگز نہیں، دونوں بالکل دو مختلف وجود ہیں۔یوں سمجھئے کہ یہ پانی اس درخت کی جان ہے ۔درخت کے جس حصہ کو پانی سے محروم کر دیا جائے وہی سوکھ جائیگا یعنی مر جائیگا ۔اب غور کیجئے کہ خدا اگرچہ اپنی مخلوق کے ظاہر و باطن میں ہر جگہ بلکہ ایک ایک ذرہ میں موجود ہے لیکن باوجود ازیں وہ سب سے الگ ہے اور اپنا ایک علیحدہ وجود رکھتا ہے۔

2۔پھول اور اس کی خوشبو

بظاہر یہ بھی ایک ہی وجود معلوم ہوتے ہیں لیکن قطعاً دو مختلف وجود رکھتے ہیں ثبوت یہ ہے کہ جب پھول باقی نہیں رہتا اس کی خوشبو اس وقت بھی باقی رہتی ہے مثلاً عطر میں بلکہ اس سے بھی زیادہ لطیف حالت میں، یعنی وہ کپڑوں میں بس جاتی ہے اور پھول کے فنا

ہو جانے کے بعد برسوں باقی رہتی ہے۔ اگر آپ نے کیوڑہ کی بالیں کبھی اپنے کپڑوں میں کچھ عرصہ رکھی ہوں اور پھر ان کو الگ کر دیا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ کپڑوں میں ان کی خوشبو کئی کئی برس قائم رہتی ہے، پھول اور اس کی خوشبو میں کوئی پردہ حائل نہیں۔ کوئی شے حد فاصل نہیں اور وہ ہر لحاظ سے ایک ہی وجود کہلانے کے مستحق ہیں، لیکن حقیقت میں وہ دو بالکل مختلف وجود ہیں۔

3۔روشنی اور حرارت

یہ بھی بظاہر ایک ہی وجود نظر آتے ہیں لیکن قطعاً دو مختلف وجود ہیں ثبوت یہ ہے کہ آپ اپنے کمرے کے سب دروازے کھول دیجئے اور دھوپ کو اندر آنے دیجئے جب دھوپ کمرے میں بھر جائے اور کمرہ خوب گرم ہو جائے تو سب دروازے بند کر دیجئے، پردے ڈال دیجئے اور دیکھ لیجئے کہ دھوپ کی کوئی باریک شعاع بھی اندر نہ آنے پائے اب دیکھئے کہ دھوپ کے کمرے سے نکل جانے کے بعد بھی کمرہ کافی عرصہ تک گرم رہے گا۔ اگر روشنی اور حرارت دونوں ایک ہی وجود ہوتے تو دھوپ کے کمرے سے نکلتے ہی گرمی بھی کمرے سے نکل جاتی، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کہ آپ گرمی کو روشنی کی ایک لازمی صفت خیال کرتے ہوں لیکن آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا یا دیکھا ہوگا کہ بعض روشنیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ٹھنڈی ہوتی ہیں، ان میں حرارت نہیں ہوتی مثلاً جگنو کی روشنی چاند کی چاندنی۔ ہم نے شملہ اور دوسرے پہاڑوں پر آدھ آدھ فٹ لمبی ایسی گنڈاریں دیکھی ہیں جن کے جسم سے جگنو کی بہ نسبت دس دس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ روشنی نکلتی ہے۔ مگر وہ ٹھنڈی ہوتی ہے۔

4۔شربت اور انسان

ایک گلاس لے کر اس میں پانی بھریئے۔ اب اس میں چینی اور خوشبو ڈال کر اتنا ملایئے کہ سب یک جان ہو جائیں۔ اب سوچئے کہ گلاس میں جو کچھ موجود ہے وہ ایک

وجود ہے یا تین مختلف وجود ہیں۔ممکن ہے کوئی کہے کہ ایک ہی وجود ہے لیکن یہ غلط ہے ایک گھونٹ لے کر دیکھئے آپ کو پانی ،مٹھاس ،خوشبو،تینوں کا الگ الگ احساس ہوجائیگا۔اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر دو چار یا اس سے بھی زیادہ چیزیں مل کر بظاہر ایک وجود بن جائے تب بھی اس ایک وجود میں ان سب کی وجودیت بالکل محفوظ ہے۔

اب انسان کو لیجئے ،فرض کیجئے انسان ایک بوتل ہے جس میں بہت سی چیزیں تو صاف نظر آتی ہیں مثلاً ہڈیاں، گوشت ،پوست ،خون اور عضلات وغیرہ لیکن بعض نظر نہیں آتیں مثلاً حرارت غریزی اور پانی وغیرہ۔موجودہ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کے بدن میں اس کے وزن کا تین چوتھائی حصہ پانی ہوتا ہے۔اسی طرح حرارت ہے کہ وہ بھی سر سے پاؤں تک بدن کے ہر ذرہ میں پانی کے ساتھ ساتھ موجود
ہوتی ہے،اس طرح دونوں کو ایک وجود سمجھا جا سکتا ہے لیکن حقیقتاً دونوں دو الگ الگ وجود ہیں کیونکہ دونوں کا اپنا اپنا کام اور اثر مختلف ہوتا ہے۔ان کے علاوہ انسان میں اور بھی کئی قوتیں ہیں جو قطعاً مادی نہیں مثلاً نفس ،روح اور عقل ان کی ماہیت کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی لیکن یہ سب بدن میں ایک ہی جگہ موجود ہیں اور ساری دنیا ان کے مختلف کاموں کی وجہ سے ان کو تین الگ الگ وجود تسلیم کرتی ہے۔

5۔فضا

فضا میں بھی بے شمار چیزیں بھری پڑی ہیں ان میں سے دو چیزوں کا ہمیں علم ہے۔ایک ہوا،دوسرے بھاپ سے کہیں زیادہ لطیف پانی جو ہوا کے اندر گھسا ہوا ہے یا ہوا پانی کے اندر گھسی ہوئی ہے۔بہر حال یہ دونوں چیزیں ایک وجود معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں دو مختلف وجود ہیں اور اپنا کام الگ الگ کرتے ہیں۔ہوا اور پانی کے علاوہ فضا میں برقی قوت ہے،مائیکرو ویوز (MICRO-WAVES) ہیں، ریڈیائی لہریں ہیں ،قوت کشش ہے ،کئی طرح کی گیسیں اور شعاعیں ہیں اور ایتھر ہے۔اب سوچنے کی بات یہ

ہے کہ یہ سب ایک ہی جگہ ہیں ۔ان کو نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں کیونکہ بیچ میں کوئی حد فاصل نہیں نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب گڈمڈ ہو کر ایک ہی وجود ہیں ۔ کیونکہ ان سب کے کام اور تاثرات بالکل الگ الگ ہیں ۔ جب ایک شہر میں ریڈیو اسٹیشن اور ٹیلی ویژن سٹیشن دونوں کام کر رہے ہوں تو گانے اسی فضا اور انہی لہروں کے ذریعہ لوگوں کے ریڈیو سیٹوں پر پہنچتے اور ٹیلی ویژن کی تصویریں اسی فضا میں سے گذر کر مختلف ٹیلی ویژنوں تک پہنچ جاتی ہیں ۔نہ آواز تصویروں کے لیے رکاوٹ بنتی ہے نہ تصویریں آواز کو روک سکتی ہیں ۔یہ تو مادی اشیاء ہیں ۔قرآن تو کہتا ہے کہ جنت بھی اسی فضا میں موجود ہے ۔ (آل عمران آیت 133)

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ٥ اور سورۃ الحدید آیت 21 **سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ** میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے ۔ **سُبْحَانَ اللّٰهِ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ** انسان کیا خاک جانتا ہے اور جو کچھ جانتا ہے اس کو کیا خاک سمجھ سکتا ہے ۔اللہ ہی جانے کہ یہ بے شمار چیزیں ایک ہی جگہ بلکہ ایک ہی ہوتے ہوئے کس طرح اپنا اپنا الگ وجود قائم رکھتی ہیں اور اپنا اپنا کام سرانجام دیتی رہتی ہیں جو بسا اوقات ایک دوسری کے کام کے متضاد بھی ہوتا ہے ۔اسی طرح اگر اللہ بھی ان تمام چیزوں میں ہوتے ہوئے سب سے الگ ہے تو اس میں تعجب کیا ہے اور اس کو ایک الگ وجود ماننے میں کیا قباحت ہے؟

6۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ط

(ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں)

اس آیت کو بھی یہ لوگ اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں کہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب تو انسان کی اپنی ہی ذات ہو سکتی ہے لہٰذا انسان کی ذات خود خدا کی ذات ہوئی ۔ ہم نے اوپر جو مثالیں دی ہیں اگر آپ نے ان کو غور سے پڑھا اور اچھی طرح سمجھ لیا ہے تو

مختلف وجودوں کے قرب و بعد کی حقیقت اچھی طرح جان گئے ہوں گے اس لیے یہاں مزید وضاحت کی ضرورت نہیں، وہی ساری مثالیں اس آیت پر بھی صادق آتی ہیں۔

7۔وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ ط یہ آیت بھی وحدت الوجود کی تائید میں پیش کی جاتی ہے پوری آیت اس طرح ہے:۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْلَهٗ سَاجِدِيْنَ ط (الحجر)

(اور جب میں اس کو (قالب آدم کو) درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم (فرشتے) اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا) اب وجودیوں کی دلیل یہ ہے کہ سجدہ سوائے خدا کے کسی کو جائز نہیں۔پس جب خدا نے آدم کے قالب میں اپنی روح پھونک دی اور فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا، وہی روح اب بھی ہر انسان میں موجود ہے اس لیے آدمی خدا کا عین یعنی خود خدا نہیں تو اور کیا ہے۔بظاہر تو دلیل بہت زوردار ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے اپنی ساری روح آدم کے قالب میں پھونک دی تو پھر خدا کیسے زندہ رہا اور اگر یوں کہیں کہ تھوڑی سی روح پھونکی تھی تو پھر نعوذباللہ خدا کی روح کے ٹکڑے ہوجاتے ہیں۔تیسرے اس سے حلول کا مسئلہ بھی

پیدا ہوتا ہے جو متفقہ طور پر کفر و زندقہ ہے اور خود حضرت ابن عربیؒ بھی اس کو کفر ہی سمجھتے ہیں۔اب پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر آدم کے قالب میں خدا نے جو کچھ بھی پھونکا تھا وہ کیا تھا؟ کئی صوفی بزرگوں نے لکھا ہے کہ یہ اللہ کی روح کا فیض تھا اور ہم کو بھی یہی بات درست معلوم ہوتی ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ عوام یہ نہیں سمجھ سکتے کہ فیض کیا چیز ہے۔فیض کو تو صرف وہ سالک اور صوفی ہی سمجھ سکتے ہیں جن کو فیض لینے اور فیض دینے کی توفیق اللہ نے دی ہے۔جن کو تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ فیض ایک جیتی جاگتی قوت ہے جو قلب میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔یہ بجلی کے کرنٹ جیسی قوت ہے جو قلب کو جگا دیتی ہے اور سوئی ہوئی روح کو زندہ بیدار کردیتی ہے۔بہرحال آدم کے قالب میں جو کچھ بھی پھونکا گیا وہ خدا کی روح ہرگز نہ تھی کیونکہ ایسا ماننا تو کفر و زندقہ ہے جیسا کہ ابھی اوپر بیان ہوا۔

ایک اور آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آدم کے قالب میں جو کچھ پھونکا گیا وہ خدا کی روح نہ تھی بلکہ خدا کا حکم تھا وہ آیت یہ ہے۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ ۔(اے محمد ﷺ)

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ روح کیا چیز ہے کہہ دیجئے کہ روح خدا کا حکم ہے،اس آیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے آدم کے قالب میں جو کچھ پھونکا تھا وہ خدا کی روح (جیسا کہ ہم اپنی روح پر قیاس کرتے ہیں) ہرگز نہ تھی بلکہ خدا کا حکم تھا یا پھر جیسا کہ ہم نے ابھی بتایا ہے کہ یہ خدا کا فیض تھا۔افسوس ہے کہ فیض کے معنی صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کو فیض دینے اور فیض کے وصول کرنے کی طاقت ہو۔دوسرے لوگ خواہ کتنے ہی پڑھے لکھے عالم و فاضل ہوں،اگر روحانیت سے بہرہ ور نہیں تو فیض کے معنی ہرگز نہیں سمجھ سکتے کیونکہ یہ آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ قلب و دماغ اور روح کو محسوس ہوتا ہے۔فیض دراصل روح کی طاقت ہے،جب کوئی مرشد اپنے کسی مرید کو فیض دیتا ہے تو گویا اپنی روح کی قوت کو اس کے قلب میں داخل کر دیتا ہے۔مرید اس طاقت کو اپنے قلب میں داخل ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے اور پھر خود اس کی اپنی روحانی قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔دوسری مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایک ماں اپنے بچوں کو اپنے ''خون کی روح'' یعنی دودھ پلاتی ہے اور اس سے بچوں میں زندگی کی قوت نشوونما پاتی ہے اسی طرح مرشد اپنی روح کا انس اپنے مرید کے قلب میں ڈالتا ہے جس سے مرید کی روح پرورش پاتی اور طاقت حاصل کرتی ہے۔اس طرح ثابت ہوا کہ وہ چیز جو خدا نے آدم کے قالب میں داخل کی وہ یہی قوت تھی اس سے زیادہ واضح طور پر سمجھانے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

یہاں تک ہم نے تقریباً وہ سب آئتیں لکھ دی ہیں جو وجودی حضرات اپنے دعوے کی دلیلوں کے طور پر پیش کیا کرتے ہیں۔ان آیات کے علاوہ یہ لوگ ایک اور دلیل بھی عام طور پر پیش کرتے ہیں جو اگرچہ قرآن کی آیت تو نہیں ہے مگر ہے بہت زوردار اور ہمیشہ پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ''صفات ذات کا عین ہیں یا غیر'' یہ ایک فلسفیانہ دلیل ہے اور

عام آدمی تو کیا بہت اچھے تعلیم یافتہ لوگ بھی یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ صفات، ذات کا غیر ہیں اس لیے وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ وجودیوں کا مطلب یہ ہے کہ جب صفات، ذات کا عین ہیں اور صفات ہی اس تمام کائنات میں ہر وقت حاضر و ظاہر نظر آتی ہیں اس لیے یہ سب ایک ہی وجود ہوا اور ثابت ہو گیا کہ نظریہ وحدت الوجود درست ہے۔ مگر ہم فلسفیانہ انداز کے جواب سے بچتے ہوئے ایک سیدھا سادہ جواب پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے کہ **سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ط**

(یعنی خدا پاک ہے تمام صفات سے) مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذاتِ بحت (ABSOLUTE SELF) میں کوئی بھی صفت نہیں ہے پس جب خود اللہ تعالیٰ ہی نے فرما دیا کہ ہماری ذات میں کوئی صفت موجود ہی نہیں ہے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ صفات، ذات کی عین ہیں یا غیر۔

اب بالکل ممکن ہے کہ کوئی سالک یہ پوچھ بیٹھے کہ جب ذات میں کوئی صفت موجود ہی نہیں ہے تو پھر یہ صفات کہاں پیدا ہوتی ہیں اور کس طرح کام کرتی ہیں یہ سوال چونکہ وحدت الوجود کے مسئلے سے بالکل مختلف اور خالص عملی سلوک کا سوال ہے اس لیے ہم یہاں اس کا جواب نہیں دے سکتے۔

دوسرے یہ کہ اس سوال کا جواب عقل سے مطلق سمجھ میں نہیں آ سکتا بلکہ صرف مشاہدۂ روحانی سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم امر میں کس مقام پر یہ صفات پیدا ہوتی ہیں اور پھر تمام کائنات میں جاری و ساری ہو جاتی ہیں لہٰذا اس معاملہ میں ہم کو معذور سمجھ کر معاف کیا جائے۔

قرآن میں جو توحید بیان کی گئی ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ کفار و مشرکین جو بتوں یا خدا کے سوائے اور چیزوں کو پوجتے تھے ان کو اس سے منع کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ پوجنے کے لائق صرف خدا ہے وہی ہر چیز کا خالق ہے، وہی قادرِ مطلق ہے، وہ ہر لحاظ سے یکتا اور لامثال ہے اسی کو پوجو اور اسی کی عبادت کرو، اسی سے ڈرو، اسی سے امید رکھو اور اسی سے

مانگو جو مانگنا ہے۔ یہ ہے قرآن کی توحید اور بس! اب اگر کوئی شخص اثبات توحید کے جوش و خروش میں مبالغہ آرائی پر اتر آئے اور اپنے تبحر علمی کے اظہار میں اس سیدھی سی بات کو منطق و فلسفہ کے کبھی نہ سلجھنے والے پیچاک میں ڈال کر یہاں تک کہہ گذرے کہ اصل توحید تو یہ ہے کہ وجود صرف ایک ہے اور وہ خدا کا وجود ہے اور جس کو تم مخلوق سمجھتے ہو یہ اسی وجود خداوندی کی شانیں یا تجلیات اور اس کی ذات کا عین یعنی خود خدا ہیں تو بتایئے کہ آپ اس کی بات کو مانیں گے یا قرآن میں بتائی ہوئی سیدھی سادی توحید کو۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت ابن عربیؒ اور حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ نے وحدت الوجود کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اپنے کشف اور مشاہداتِ روحانی سے لکھا ہے اس لیے ہم آگے سلوک کے بیان میں اس مقام کی نشاندہی کریں گے جہاں حضرت ابن عربیؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت کو حقیقت سمجھ لیا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ پہلے میں بھی وحدت الوجود کو مانتا تھا اور اس مقام پر مجھ کو بڑا سرور، کیف اور اطمینان میسر تھا لیکن جب میں نے آگے ترقی کی تو ایک مقام پر پہنچ کر میں اس بات کا قائل ہوگیا کہ مخلوق ذات باری تعالیٰ کا ظل ہے لیکن یہ بھی غلط فہمی تھی جب میں آخری مقام (مقام عبدیت) پر پہنچا تو اصل حقیقت منکشف ہوئی اور میں نے دیکھ لیا کہ خدا خدا ہے اور مخلوق مخلوق ہے۔ (مکتوبات امام ربانی۔ مکتوب 31 اور 160)

یہاں یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مجددؒ نے وحدت الوجود کے خلاف جو کچھ لکھا اور جو حقیقت ثابت کی اس کو لوگ وحدت الشہود کا نام دیتے ہیں اور وحدت الوجود و وحدت الشہود کو ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ شاید ہمارے ناظرین میں سے کوئی صاحب یہ خیال کریں کہ اس کتاب میں وحدت الشہود کی بابت تو کچھ لکھا ہی نہیں گیا، اس لیے ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ وحدت الشہود کوئی خاص نظریہ نہیں ہے بلکہ حضرت مجددؒ کی تمام تقریر و تحریر کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابن عربیؒ کو جس مقام پر وجود ایک نظر آیا وہ درست تھا۔ وہاں وجود ایک ہی نظر آتا ہے مگر در حقیقت یہ صرف شہود یعنی دیکھنے میں ایک ہوتا ہے حقیقت میں ایک نہیں ہوتا۔ اب ہم سلوک کا بیان کرتے ہیں۔

٦

مقامات وکیفیاتِ سلوک

سلوک کے لفظی معنی ہیں سفر کرنے کے، لیکن تصوف کی اصطلاح میں سلوک کہتے ہیں روح کے سفر کو جو وہ سالک کی ذات سے خدا کی ذات تک طے کرتی ہے۔ اس باب میں ہم یہ بتائیں گے کہ روح اس سفر میں کن کن طبقات وعوالم میں سے گزرتی ہے اور کیا کیا کچھ دیکھتی یا محسوس کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی بتائیں گے کہ روح کی ماہیت کیا ہے اور وہ کس شکل میں یہ سفر طے کرتی ہے۔ یہ دونوں باتیں ہم بہت مختصر طور پر بیان کریں گے۔ مفصل دیکھنا ہو تو ہماری کتاب "تعمیر ملت" میں ملاحظہ فرمائیں۔

روح کا سفر اس مادی عالم یعنی کرۂ زمین سے شروع ہو کر عرش کبریا پر اس جگہ ختم ہوتا ہے جہاں سالک کو اللہ کی ذات بحت کا عرفان ہوتا ہے جس میں نہ کوئی رنگ و بو ہے، نہ امتداد ہیں نہ کوئی صفت ہے اور جس کی بابت وہ خود قرآن میں ارشاد فرماتا ہے **سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ** ۔ ترجمہ (پاک ہے وہ ذات تمام صفات سے) اس سفر میں کرۂ زمین سے چل کر سب سے پہلے دوزخوں کا طبقہ آتا ہے، اس کے بعد اعراف ہے پھر جنتوں کے طبقات شروع ہوتے ہیں جن میں پہلا عالم ملکوت کہلاتا ہے، دوسرا جبروت، تیسرا لاہوت، چوتھا ہاہوت اور پانچواں ھُو۔

دوزخ کے طبقات سے عالم ھو کے آخر تک عالم مثال کہلاتا ہے اس کے بعد عالم امر شروع ہوتا ہے جس میں بے شمار لطائف ہیں مگر قابل ذکر صرف یہ لطائف ہیں۔ پہلے لطیفہ عدم ہے پھر لطیفہ نفس، پھر لطیفہ عقل اور اس کے بعد لطیفہ روح ہے۔ ان لطائف سے آگے حوالیٔ عرش کا علاقہ ہے پھر عرش مجید ہے جس کے عین مرکز میں سالک کو ذات بحت کا مشاہدہ اور عرفان ہوتا ہے۔ اسی جگہ سالک کا سفر روح ختم ہو جاتا ہے اور وہ عارف کامل اور ولی مکمل بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات ضرور یاد رکھئے کہ ہر سالک جو یہ سفر شروع کرتا ہے ذات بحت تک نہیں پہنچ سکتا۔ لاکھوں میں سے ایک دو کو یہ درجہ اور

سعادت نصیب ہوتی ہے۔باقی سالکوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے مقام محمود تک پہنچ کر رک جاتا ہے۔کسی کا مقام محمود ملکوت میں ہوتا ہے، کسی کا جبروت میں کسی کا ہاہوت میں اور کسی کا ھُو میں۔

اب کچھ تھوڑا سا حال ہر ایک طبقہ کا بیان کیا جاتا ہے تا کہ ناظرین کے دماغ میں ایک نقشہ یا خا کہ ان تمام طبقات کا قائم ہو جائے اور جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کے سمجھنے میں مدد ملے۔کرۂ زمین کی اشیاء کا علم یا احساس ہم کو حواس خمسہ کے ذریعے ہوتا ہے لیکن یہاں خالص مادی اشیاء کے علاوہ فضا میں کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا علم ہم کو عقل و تجربہ سے حاصل ہوا ہے مثلاً سب سے پہلے تو ہوا ہے اور اس میں بھی کئی گیسیں اور پانی ہے، کئی طرح کی شعاعیں اور لہریں ہیں مثلاً وائلٹ ریز، ریڈیائی لہریں اور مائیکروویز وغیرہ، ان کے علاوہ مقناطیسی لہریں یا قوت کشش، حرارت اور ایتھر وغیرہ بھی ہیں۔یہ سب چیزیں اس طرح ایک دوسرے کے اندر سموئی ہوئی ہیں کہ ہر لحاظ سے ایک وجود کہلانے کی مستحق ہیں لیکن سب اپنا اپنا ایک حقیقی اور الگ وجود رکھتی ہیں اور اپنا اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔فضا کے بعد خلاء ہے۔سائنس دان کہتے ہیں کہ خلاء میں کچھ بھی موجود نہیں ہے۔لیکن ایک مسلمان قرآن میں دی ہوئی خبروں کے مطابق اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اس فضا اور خلاء میں اوپر بیان کردہ اشیاء کے علاوہ اور بھی بے شمار چیزیں موجود ہیں۔

اتنی بات تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ خدا کی طرف سے زمین پر ہزاروں بلکہ ان گنت احکام ہر وقت نازل ہوتے رہتے ہیں اور بے شمار فرشتے جو نظام عالم کو قائم رکھنے کے لئے مقرر ہیں ان احکام کی تعمیل کرنے کے لیے ہر وقت زمین پر اترتے اور آسمان کی طرف چڑھتے رہتے ہیں۔اس طرح بے شمار فرشتے اس فضا اور خلاء میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ان کے علاوہ مرنے والوں کی روحیں بھی عالم روحانی یا برزخ کو جاتے ہوئے یہیں سے گزرتی ہیں۔قرآن میں ہے

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۝ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۝ وَّالسّٰبِحٰتِ

سَبۡحًاoوَّالسّٰبِقٰتِ سَبۡقًاo فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًاo

ترجمہ(قسم ہےان (فرشتوں) کی جوغوطہ لگا کر کھینچتے ہیں اور قسم ہےان کی جوآسانی سے کھول دیتے ہیں اوران کی جو(فضامیں)تیرتے پھرتے ہیں پھر لپک کرآگے بڑھتے ہیں اورتدبیر کےساتھ دنیاکے کاموں کاانصرام کرتے ہیں)ان آیات میں فرشتوں کاذکر ہے۔فرشتے کیاہیں؟فرشتے خداکے کارندے ہیں ۔یہ دراصل طاقتیں ہیں جوکائنات کا انتظام کرنے اورنظام قائم رکھنے کے لیےاللہ نے پیدا کی ہیں۔ کائنات اورہماری دنیا کے کام بےشمار ہیں اس لیےان فرشتوں کی قسموں اورتعداد کابھی کوئی شمارنہیں۔ان آیات میں مفسّرین نے پہلی آیت کی تفسیر یہ کی ہے کہ"قسم ہےان فرشتوں کی جوکافروں اور گنہگاروں کی جان سختی سے نکالتے ہیں"۔دوسری آیت کی تفسیر ہے"وہ فرشتے جومومنوں کی جان آسانی سے نکالتے ہیں"۔بلاشبہ یہ دونوں باتیں بھی بالکل درست ہوسکتی ہیں لیکن فرشتوں کےکرنے کےلیےصرف یہی دوکام تونہیں اورہزاروں کام بھی ہیں۔ہمارےاوپر ان دوآیات کےعجیب سےمعنی مکشوف ہوئے ہیں جواب تک کسی نےنہیں لکھے۔پہلی آیت کامطلب یہ کھلا ہے کہ یہاں وہ فرشتے یا طاقتیں مراد ہیں جوزمین کےچاروں طرف کی فضا میں سےغوطہ مارکرزمین کےمرکز کی طرف جاتے رہتے ہیں۔آپ نے دیکھاہوگا کہ جب کوئی شخص بلندی سےدریامیں کودتا اورغوطہ مارکرتہ کی طرف جاتا ہےتوآس پاس کابہت سا پانی بھی سمٹ کراس کےساتھ ہی تہ کی طرف جاتا ہے۔بعینہٖ یہی حالت ان فرشتوں کے غوطہ مارنے کےوقت بھی پیش آتی ہے کہ زمین کےاردگردفضامیں جواورچیزیں یا طاقتیں ہیں وہ زمین کی سطح سےٹکراتی ہیں اوریہ عمل چونکہ متواترہوتا رہتا ہےاس لیےزمین کی سطح پر فضا کادباؤہروقت پڑتا اورقائم رہتا ہےاوراسی کوسائنسدان کششِ ثقل کہتے ہیں۔دوسری آیت کےمعنی ہماری سمجھ میں یہ آئے ہیں کہ یہ فرشتے وہ ہیں جوزمین میں بیج کوشگافتہ کرتے ہیں،درخت میں کلی کوپھول بناتے ہیں۔پتھروں کوچٹخاچٹخا کرریت بناتے اورشہاب ثاقب کے مادی ایٹموں کوتوڑکرانرجی میں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔باقی آیات کامطلب صاف ہے کہ یہ فرشتے فضااورخلاء میں تیرتے رہتے ہیں اورخدائی احکام جواوپر سےنازل ہوتے

رہتے ہیں ان کو وصول کرنے کے لیے دوڑ کر آگے بڑھتے ہیں اور وصول کرنے کے بعد خدا کی بتائی ہوئی تدبیر کے مطابق اس کی تکمیل کر دیتے ہیں ۔زمین کے بعد دوزخ کا عالم ہے اس کی وسعت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔کوئی انسان اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔آپ چاہیں تو اسے ایک ہی طبقہ سمجھ لیں لیکن ہم نے اپنے دوران سلوک میں جو کچھ دیکھا اور سمجھا ہے عذاب کی نمایاں کمی بیشی کے لحاظ سے اس کو بہتر (72) طبقات میں تقسیم کر دیا ہے۔ دوزخ کا عالم خالصتاً روحانی ہے،اسی وجہ سے نہ ہم کو نظر آ سکتا ہے نہ کسی اور طریقہ سے محسوس و مدرک ہو سکتا ہے۔البتہ سالکان راہ طریقت کی روحیں جو عرش کی طرف جاتی ہوئی یہاں سے گزرتی ہیں ان میں سے اکثر اس کو دیکھتی ہیں لیکن بعض بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو کچھ نظر نہیں آتا اور بغیر دیکھے گزر جاتی ہیں ۔ان کے سلوک کو آپ بند گاڑی یا ہوائی جہاز کا سلوک سمجھ لیجئے لیکن مُردوں کی جو روحیں عذاب کے لئے یہاں لائی جاتی ہیں ۔وہ سب کچھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں ۔جنتی لوگوں کی روحیں جو مرنے کے بعد جنت کو جاتی ہیں ان کو بھی دوزخ میں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن ان کو یہاں کی تکلیف کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا۔سورہ مریم آیت 71 میں ہے **وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا** (ترجمہ یعنی تم میں سے ہر ایک کو دوزخ میں جانا ہے، یہ تمہارے رب کا اٹل فیصلہ ہے)اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ دوزخ زمین اور جنت کے درمیان واقع ہے۔یہیں سے پل صراط کا عقیدہ پیدا ہوا ہے۔

شاید کوئی کہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ روح دوزخ میں سے گزرے اور اس کو تکلیف نہ ہو تو ہم اس کے جواب میں ایک بہت واضح مثال پیش کرتے ہیں ۔آپ نے اخبارات میں پڑھا ہو گا کہ روس اور امریکہ کے خلائی مسافر جب راکٹ والے جہاز میں بیٹھ کر خلاء میں جاتے ہیں تو وہاں پہنچنے کے بعد خلاء پیما کبھی کبھی کمر میں رسی باندھ کر جس کا دوسرا سرا جہاز میں بندھا ہوتا ہے، جہاز سے باہر نکل آتے ہیں اور جہاز کے ساتھ ساتھ بے تکلفی سے خلاء میں اُڑتے چلے جاتے ہیں اور ان کو مطلق کوئی تکلیف نہیں ہوتی حالانکہ جہاز ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے ۔آپ کو معلوم ہے کہ ان کو تکلیف کیوں نہیں ہوتی، محض اس وجہ

سے کہ وہ ایک خاص قسم کا لباس (پریشر سوٹ) پہن کر خلائی سفر کرتے ہیں۔اس لباس کی وجہ سے خلاء کے بالکل نئے اور مخالف حالات کا اثر ان کے جسم پر نہیں ہونے پاتا۔بالکل اسی طرح جو لوگ نیکی کی زندگی بسر کرتے ہیں ان کی نیکیاں ان کے جسم کے گرد ایک ایسے لباس کی شکل اختیار کرلیتی ہیں کہ دوزخ کی آگ ان کے جسموں پر مطلق اثر نہیں کرتی۔کیا اس سیدھی اور سچی مثال کو دیکھ کر بھی آپ اپنے لیے نیکیوں کا وہ لباس مہیا کرنے کی کوشش نہ کریں گے جو آپکو دوزخ کی آگ اور دوسری تکالیف سے محفوظ رکھے اللہ تعالی فرماتا ہے کہ تقویٰ کا لباس سب سے اچھا لباس ہے۔عام لوگ خیال کرتے ہیں کہ دوزخ میں ہر جگہ صرف آگ ہی آگ ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ان لوگوں کا یہ خیال درست نہیں دوزخ میں تو مثالاً ہماری زمین کے چٹیل اور بنجر میدانوں، بے برگ و گیاہ بیابانوں، ریگستانوں اور جلے وسوکھے پہاڑوں جیسے طبقات ہیں جہاں کھانے کو خاردار جھاڑیاں اور تھوہر وغیرہ اور پینے کو سخت کڑوے اور گرم پانی کے سوا اور ہے ہی کچھ نہیں (دیکھئے قرآن اور احادیث نبویؐ) انہی طبقات میں جابجا آگ کے بڑے بڑے قطعے بھی ہیں بالکل اسی طرح جس طرح ہماری زمین پر کہیں کہیں آتش فشاں پہاڑ ہیں۔جن روحوں کو صرف دوزخ کی سزا ہوتی ہے وہ آگ میں نہیں ڈالی جاتیں لیکن جن کو آگ کی سزا دی جاتی ہے وہ آگ میں پھینک دی جاتی ہیں۔بعض روحوں کو دونوں سزائیں ملتی ہیں دیکھئے سورہ البروج کی دسویں آیت جس میں بتایا گیا ہے کہ **إِنَّ الَّذِينَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوبُوا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيقِ** (ترجمہ جن لوگوں نے مومنوں اور مومنات کو تکلیفیں دیں اور پھر توبہ نہیں کی تو ان کو دوہرا عذاب ہے، جہنم کا بھی اور آگ کا بھی) آپ سوچیں کہ آپ نے تو کسی مومن اور مومنہ کو تکلیف نہیں دی اگر دی ہے تو اس سے معافی مانگیں کیونکہ یہ حقوق العباد میں شامل ہے خدا اس کو معاف نہیں کرے گا۔دوزخ کا سب سے نچلا طبقہ زمین سے ملا ہوا ہے۔اس طبقہ میں سب سے زیادہ سخت اور شدید عذاب ہے۔کافر، مشرک اور بہت ہی زیادہ سیاہ کار مسلمانوں کی روحیں یہاں عذاب بھگت رہی ہیں۔اس سے اوپر کے طبقہ میں نسبتاً کم عذاب ہے اور پہلے طبقہ والوں کی بہ

نسبت کچھ اچھے اخلاق والے کافر و مشرک اور پہلوں سے کم گناہ گار مسلمانوں کی روحیں یہاں رہتی ہیں ۔اسی طرح جتنے اوپر کی طرف چلیں عذاب کم ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ سب سے آخری طبقہ میں معمولی سی آسائشیں اور معمولی قسم کی تکلیفیں دونوں ملی جلی ہیں، یہ طبقہ دوزخ کے آخری سرے پر ہے اور اس کے بعد ایک دیوار ہے جس کا نام اعراف ہے ۔دیکھئے سورہ اعراف **وَ بَیْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ یَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِیْمٰهُمْ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ لَمْ یَدْخُلُوْهَا وَهُمْ یَطْمَعُوْنَ** o یہاں دوزخ ختم ہو جاتا ہے ۔اعراف کے بعد جنتوں کے عوالم شروع ہوتے ہیں جو نیچے سے اوپر کی طرف طبق بر طبق عالم ھو تک چلے گئے ہیں ۔سالک کی روح انہی طبقات میں سے گزرتی ہوئی اُوپر چڑھتی ہے جیسا کہ سورہ انشقاق میں ہے **لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ** تم کو چڑھنا ہے طبق طبق کرکے ،، یہ جنتیں بھی بجائے خود ایک کائنات ہیں جو زمین و آسمان کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہیں ۔دیکھئے سورہ آل عمران آیت 133 **وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ** ،اور الحدید آیت 21 **سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ** o جنتوں کا پہلا طبقہ عالم ملکوت کہلاتا ہے، اس کو ہم نے نیک اعمال کے تفاوت کے لحاظ سے 36 خیالی طبقوں میں تقسیم کیا ہے دوسرے عالم کا نام جبروت اور تیسرے کا لاھوت ہے ۔ان دونوں میں 18-18 طبقات ہیں ۔ملکوت کا جو طبقہ اعراف سے ملا ہوا ہے اس میں معمولی مسلمانوں کے لیے معمولی قسم کی جنتیں ہیں ۔اس سے اوپر کا طبقہ کچھ بہتر اور تیسرا طبقہ دوسرے سے اور چوتھا تیسرے سے کچھ بہتر ہے ۔**وقس علیٰ ھذا** ۔چھتیسویں طبقے کی جنتیں پچھلے تمام طبقات سے بہتر اور اعلیٰ ہیں ۔یہ اعلیٰ درجے کے مسلمانوں کے لیے ہیں ۔اس کے بعد عالم جبروت شروع ہوتا ہے ۔جبروت کے شروع ہوتے ہی منظر بالکل بدل جاتا ہے ۔یہاں کی جنتیں شان و شوکت، آرام و آسائش، باغات و

انہار اور حور وقصور کے لحاظ سے ملکوت کی جنتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور متمیز ہیں ۔ یہاں بڑے متقی، متورع، عابد وزاہد اولیاء اور مومنوں کے محلات ہیں ۔اس کے بعد لاھوت ہے۔ ان جنتوں کا تو کہنا ہی کیا، یہ تو حسن وخوبی، نفاست ونزاکت، نعائم ولذائذ اور کوائف کے لحاظ سے قطعاً مثالی بلکہ خیالی معلوم ہوتی ہیں ۔یہاں بہت ہی عالی مرتبت مومن اولیاء، اصفیاء، صدیقوں اور شہیدوں کی روحیں رہتی ہیں۔

لاھوت کے بعد ھاھوت کا عالم ہے ۔اس کے چودہ طبقات ہیں ۔یہاں پہلے ہی طبقہ سے صور واشکال اس قدر باریک، دھندلی اور لطیف ہو جاتی ہیں کہ مشکل ہی سے نظر آتی ہیں اور دو چار طبق آگے نکلنے کے بعد تو ان کا نام ونشان بھی نہیں رہتا صرف معنویت ہی معنویت رہ جاتی ہے۔یہاں سے جو کچھ مکشوف ومشہود ہونا شروع ہوتا ہے

وہ دنیا کی کسی زبان کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ھاھوت کے بعد عالم ھو ہے۔ اس کو طبقات میں تقسیم کرنا ناممکن ہے ۔یہ نور جیسی ایک شے کا ناپیدا کنار سمندر ہے ۔جس کو خدا کچھ دکھانا چاہے وہ یہاں بھی بہت کچھ دیکھتا ہے ،لیکن جو کچھ مکشوف ومشہود ہوتا ہے وہ بھی بیان نہیں کیا جا سکتا ۔اس عالم کو مثالاً ہماری زمین کی فضا کے طور پر سمجھنا چاہئے کہ جیسے فضا میں اگرچہ بہت کچھ ہے مگر نظر نہیں آتا ہاں عقل وتجربہ سے معلوم ہو سکتا ہے ۔اسی طرح ھو میں بھی بہ ظاہر کچھ نظر نہیں آتا لیکن کشف اور دل کی آنکھ سے بہت کچھ دکھائی دیتا اور معلوم ہو جاتا ہے لیکن اگر ہم اس کو بیان کریں تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا کیونکہ ہماری دنیا میں ان چیزوں کی مثالیں موجود نہیں ہیں ۔جن سالکوں کی روحیں یہاں زیادہ عرصہ قیام کرتی ہیں ان کو بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے ۔دوزخ سے ھو کی انتہا تک جو عالم ہے وہ عالم مثال کہلاتا ہے ۔ھو کے بعد ایک بالکل ہی نیا عالم شروع ہوتا ہے جس کا نام عالم امر ہے ۔اس کا پہلا طبقہ یا لطیفہ عدم کہلاتا ہے ۔یہاں بھی مطلقا کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو نظر آ سکے یا عقل وتجربہ سے معلوم ہو سکے ۔اس کو آپ مثالاً ایسا سمجھ لیں جیسا کہ ہماری فضا کے اوپر خلاء ہے۔ عدم دراصل ایک تخریبی یا منفی قوت ہے بسیط شکل میں ۔عدم کے بعد نفسِ بسیط، پھر عقلِ بسیط، پھر روحِ بسیط کے لطائف ہیں ۔روح کے بعد سوادِ عرش ہے جہاں اللہ تعالی کی صفاتی

تجلیات ظاہر ہو کر تمام عالم میں ہر وقت جاری وساری رہتی ہیں ۔اس کے بعد عرش اعظم ہے ۔یہ ذاتی تجلیات کا عالم ہے اور اسی کے مرکز میں اللہ تعالی کی وہ ذات بحت مشہود ہوتی ہے جس میں نہ کوئی رنگ ہے نہ نور، نہ صفت ،اس کا مطلب آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ ذات بحت یہاں کسی خاص مقام یا علاقے میں مقید ومحدود ہے، مطلق نہیں ۔وہ ذات تو اپنی تمام صفات و بے صفاتی کے ساتھ کائنات کے ذرہ ذرہ میں موجود ہے لیکن سالک کو اس کا مشاہدہ یا عرفان اسی مقام پر حاصل ہوتا ہے ۔یہ ہے ایک معمولی اور سادہ سا خا کہ ان عوالم کا جن میں سے گزر کر سالک کی روح اپنے مقام محمود یا ذات بحت تک پہنچتی ہے ۔

اب کچھ حال روح کا بھی سن لیجئے ۔عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ روح کوئی محدود جسم والی ایسی چیز ہے جو بدن سے نکل کر گیند کی طرح یا کسی پرندے کی طرح آزاد ہو جاتی ہے اور ادھر اُدھر اڑتی پھرتی ہے، یہ بات نہیں ہے ۔روح کی مثال تو ایک شعاع کی سی ہے جس کی اوپر کی چوٹی ہر وقت خدا کے ہاتھ میں رہتی ہے اور نیچے کا سرا انسان کے دماغ میں پیوست ہو کر بدن کے ہر ذرہ پر اپنا عکس ڈالتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے **وَمَامِنْ دَآبَّةٍ اِلاَّهُوَ آخِذٌبِنَا صِيَتِهَا** (یعنی کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو اللہ نے اس کی چوٹی سے نہ پکڑ رکھا ہو) یہ ایک ایسا واسطہ خدا کا اپنے ایک بندے کے ساتھ ہے جو کسی دوسرے بندے کے ساتھ نہیں ہے ۔حضرت حسن بصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ خدا سے ملنے کے کتنے راستے ہیں ،فرمایا کہ جتنے جاندار اس دنیا میں پیدا ہو چکے ہیں یا آئندہ ہوں گے اتنے ہی راستے ہیں ۔یہاں حضرت حسن بصریؒ کی مراد یہی روحانی شعاعیں ہیں ۔یہ شعاع نان کنڈکٹر ہے یعنی کوئی شے اس کو قطع نہیں کر سکتی ۔یہ ہر چیز میں سے گزر جاتی ہے اور ہمیشہ قائم رہتی ہے ۔یہ اس قدر لچک دار اور سریع السیر ہے کہ ایک سیکنڈ میں تمام کائنات کا چکر لگا کر پھر اپنی جگہ پر آجاتی ہے ۔اس شعاع کے ہر ذرہ میں اس انسان کا ایک پیکر مثالی یا ہم زاد موجود ہوتا ہے جو ہو بہو اسی کی شکل کا ہوتا ہے ،فرق صرف یہ ہے کہ عالم روحانی میں جتنا اُوپر کی طرف بڑھو ہر جسم پچھلے جسم سے چھوٹا اور لطیف تر ہوتا جاتا ہے ۔درحقیقت یہ ایک ہی جسم کے بے انتہا مثنی ہیں ۔ان کی بابت نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سے جسم ہیں نہ یہ کہ یہ سب

ایک جسم ہے۔اس کا صحیح علم صرف مشاہدہ کرنے والوں کو ہوسکتا ہے، کتابوں میں کتنا ہی کھول کھول کر سمجھایا جائے مشکل ہی سے کچھ سمجھ میں آتا ہے، تاہم ایک تصور دماغ میں قائم ہوجاتا ہے جو تفکر کرنے والوں کی خاصی رہنمائی کرسکتا ہے۔قارئین کرام سے گزارش ہے کہ روح کی پوزیشن سمجھانے کے لیے ہم نے پیچھے جو مثال سینماہال کی دی ہے اس موقع پر یادداشت تازہ کرنے کے لیے اسے دوبارہ پڑھ کر اچھی طرح سمجھ لیں تو یہ مضمون اچھی طرح سمجھ میں آجائیگا۔اب یہ تو معلوم ہوگیا کہ انسان یا سالک کی ذات سے خدا کی ذات تک کون کون سے طبقات وعوالم موجود ہیں اور ان میں اس کی روح کس طرح قائم ہے۔اب جاننا چاہئے کہ روح کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کے اعمال سے فوراً متاثر ہوتی ہے۔اگر انسان برے کام کرے تو پہلے اس کا قلب، پھر نفس متاثر ہوتا ہے اور نفس کا اثر براہ راست روح پر پڑتا ہے اور روح ایک قسم کی کمزوری اور نقاہت محسوس کرتی ہے۔اب اگر وہ آدمی متواتر برے کام ہی کرتا رہے تو روح کمزور ہوتے ہوتے بہت ہی زیادہ نحیف ہوجاتی ہے، اس کا رنگ جو نور جیسا روشن ہے سیاہ پڑتا جاتا ہے۔اس کی لطافت کثافت میں بدلتی جاتی ہے اور آخر کار روح کوڑھیوں کی طرح مجروح اور داغدار ہوتے ہوتے بالکل مسخ اور مفلوج ہوجاتی ہے اور کثیف اور بھاری ہونے کی وجہ سے عالم ارواح میں اوپر کی طرف پرواز نہیں کرسکتی اور بے حس وحرکت ہوکر دوزخ کے طبقات میں گر پڑتی ہے اور جب تک جل جل کر بالکل پاک اور لطیف نہ ہوجائے آگے نہیں بڑھ سکتی، یہی سزائے دوزخ ہے۔برخلاف ازیں جو آدمی نیک کام کرتا ہے اس کی روح طاقتور، ہلکی اور لطیف ہوتی جاتی ہے اور جتنا وہ نیک ہوتا ہے اسی نسبت سے روحانی شعاع جنت کے کسی طبقہ تک پہنچ کر وہاں کے نعائم سے لطف اندوز ہوتی ہے۔اس بات کو زیادہ اچھی طرح سمجھانے کے لیے ہم راہ سلوک کے ایک مسافر یعنی سالک کی روح کا حال بیان کرتے ہیں کہ اس کی نیکی اور اس کا ذکر وفکر کس طرح اس کی روح پر اثر کرتے ہیں اور وہ کس طرح آگے ترقی کرتا ہے۔ہوتا یہ ہے کہ کچھ عرصہ تک باقاعدہ ذکر کرنے اور مرشد کی توجہ کا اثر دل ودماغ پر پڑنے کے بعد سالک کے قلب میں ایک خاص قسم کا سوز اور گرمی پیدا ہوجاتی ہے۔رفتہ رفتہ اس گرمی کا اثر سالک کے نفس پر

ہوتا ہے اور نفس بھی گرم ہوجاتا ہے۔اس وقت سالک پر ایک نہایت ہی پرکیف بے خودی طاری ہونے لگتی ہے اسی بے خودی کو جذب کہتے ہیں۔یہی وہ حالت ہے جس میں سالک سے عجیب وغریب قسم کی کرامات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔نفس کے گرم ہوتے ہی روح بھی گرما جاتی ہے اور کیف و بے خودی سے سرشار رہنے لگتی ہے۔لیکن سالک کی ذات سے باری تعالٰی کی ذات تک روح کی ساری شعاع گرم نہیں ہوتی بلکہ اس کا تھوڑا سا حصہ گرم ہوجاتا ہے۔یہاں تک کہ کچھ مدت میں دوزخ میں سے جو حصہ گزرتا ہے وہ سارے کا سارا گرم ہو جاتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنا حصہ گرم ہوتا ہے وہ بیدار اور باخبر یا زندہ ہوجاتا ہے یعنی اس گرم حصے میں سالک کے جتنے مثنٰی یا ہمزاد ہیں وہ سب جاگ پڑتے ہیں اور ہر وقت اللہ کی حمد وصلوٰۃ میں مصروف رہتے ہیں۔اس گرمی کی مثال بجلی سے دی جاسکتی ہے کہ جب اس کو تانبے کے مُردہ تار میں داخل کردیا جاتا ہے تو وہ تار زندہ ہوجاتا ہے اور اس سے ہزاروں کام لیے جاسکتے ہیں۔روح کا وہ حصہ جو دوزخ میں سے گزرتا ہے جب بیدار ہوجاتا ہے تو اکثر سالکوں کو دوزخ کے مختلف مقامات کے نظارے سوتے یا جاگتے میں دکھائی دیتے ہیں۔کوئی دوزخ کے لق و دق میدانوں، بے آب وگیاہ بیابانوں اور سوکھے خشک کالے پہاڑوں کا نظارہ کرتا ہے، کسی کو آگ کا عذاب ہوتا دکھائی دیتا ہے اور بعض سالکوں کو ایسے بھیانک منظر دکھائی دیتے ہیں جو وہ برداشت بھی نہیں کرسکتے۔اس کے بعد جب روحانی شعاع کا وہ حصہ بیدار ہوتا ہے جو ملکوت کی جنتوں میں سے گزرتا ہے تو سالک کو ان جنتوں کی سیر ہونے لگتی ہے۔یہاں طرح طرح کے قیمتی پتھروں کے محل، پھلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے گھنے باغات، نہریں، چشمے، رنگ برنگ کے پرند اور چوپائے وغیرہ نظر آتے ہیں۔حور وقصور کے علاوہ اس کو اپنے مرے ہوئے بزرگوں اور دوست احباب کی روحیں بھی ملتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔اس کے بعد جبروت کا عالم ہے۔جب سالک کی روح کا وہ حصہ جو اس عالم میں سے گزرتا ہے ذکر کی حرارت سے گرم ہوجاتا ہے اور اس میں سالک کے جو مثنٰی ہیں وہ بیدار ہوجاتے تو ہیں اس عالم کی سیر ہونے لگتی ہے۔جبروت کی جنتیں ملکوت کی جنتوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور نفیس و نازک ہیں۔اگر ملکوت کی جنتوں

کے قصر قیمتی اور رنگ برنگ پتھروں سے بنے ہوئے ہیں تو یہاں کے قصر سونے چاندی اور دوسری قیمتی دھاتوں سے بنے ہوئے ہیں۔ عالم جبروت کے بعد عالم لاھوت ہے جہاں پر خوبصورتی اور لطافت و نزاکت، جیسا کہ پیچھے بتایا جا چکا ہے، انتہائے کمال کو پہنچ گئی ہے۔ یہاں کے باغات، سبزے کے سدا بہار پھولوں سے لدے ہوئے قطعات، ندیاں، نہریں، چشمے اور خوش الحان پرند ہر لحاظ سے بے مثال اور بے نظیر ہیں۔ یہاں کے قصر جواہرات سے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں عابدوں، زاہدوں، صدیقوں، شہیدوں اور بڑے عالی مرتبت اولیائے کرام کی روحیں مقیم ہیں۔ ان سب طبقات کی خوبصورتی اور لطافت و نزاکت کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں۔ ہم نے تھوڑا بہت اس لیے لکھ دیا ہے کہ پڑھنے والوں کے دماغ میں ایک تصور قائم ہو جائے۔ لاھوت کے بعد ھاھوت ہے۔ جب سالک کی روح کا وہ حصہ جو یہاں سے گزرتا ہے، زندہ ہو جاتا ہے تو اس کو ایک بالکل ہی نیا منظر دکھائی دیتا ہے جو دوران سلوک میں پہلے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس طبقہ میں صورتیں اور شکلیں اس قدر لطیف ہو جاتی ہیں کہ ایک بہت ہی باریک تحریر کی مانند نظر آتی ہیں۔ اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں تک ایک ہلکا ہلکا سفید غبار (نور) سا نظر آتا ہے اور اس میں جو محلات و باغات اور جاندار وغیرہ دکھائی دیتے ہیں ان کی صورتیں اور شکلیں بالکل خیالی اور موہوم جیسی لیکن بے انتہا حسین نظر آتی ہیں۔ اگر آپ کو کسی پہاڑ پر برسات گزارنے کا موقع ملا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب بادل زمین پر آتے ہیں اور گھروں میں گھس جاتے ہیں تو ان میں سے نظر آنے والی عمارتیں اور جاندار بالکل دھندلے دھندلے مگر بہت زیادہ خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی نظارہ ھاھوت کی ابتدائی منزلوں میں ہوتا ہے اس کے بعد جوں جوں آگے بڑھتے ہیں صور و اشکال اور بھی زیادہ دھندلی ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صورتیں اور شکلیں وہیں موجود ہوتی ہیں مگر اتنی لطیف ہو جاتی ہیں کہ نظر نہیں آتیں لیکن جن اولیائے کرام اور عارفین عظام کی بصیرت بہت زیادہ ہوتی ہے وہ بہت کچھ دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

ھاھوت سے آگے ھُو کا عالم ہے۔ یہاں صورتوں اور شکلوں کا شائبہ تک بھی نہیں

رہتا۔صرف ایک نور جیسی چیز ہوتی ہے جو اوپر سے نیچے اور دائیں سے بائیں جہاں تک نظر جا سکتی ہے دکھائی دیتی ہے۔یہ نہ سمجھئے کہ صورتیں اور شکلیں یہاں موجود ہی نہیں یقیناً موجود ہیں اور اس قدر زیادہ ہیں کہ سارا عالم ان سے معمور ہے۔لیکن وہ ہاں سے بھی کہیں زیادہ باریک و نازک اور اس قدر لطیف ہیں کہ صرف انہی بزرگوں کو نظر آ سکتی ہیں جن کو اللہ نے بہت ہی زیادہ روحانی بصیرت عطا فرمائی ہو۔چنانچہ حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کو خدا نے ایسی ہی بصیرت عطا فرمائی تھی۔جب وہ ھاھوت طے کر کے اس عالم میں داخل ہوئے تو پچھلے تمام عوالم (جن کو وہ طے کر آئے تھے) کے مقابلہ میں یہاں کی لامحدودیت، یک رنگی اور لطافت کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور اس نظارے سے اس قدر سکون و کیف اور فرحت ان کو حاصل ہوئی کہ آگے قدم نہ بڑھا سکے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ عرصہ دراز تک یہیں رہنے کے بعد جب ان کی روحانی آنکھ عادی ہو گئی تو رفتہ رفتہ ان کو یہاں کی ارواح اور فرشتوں کی شکلیں اور صورتیں بھی نظر آنے لگیں اور وہ یہ سمجھے کہ یہ (ھو) ذات احدیت ہے اور اسی میں سے تمام صورتیں اور شکلیں ظہور پذیر ہوتی اور اسفل کی طرف نزول کرتی ہیں یہاں تک کہ مادی عالم میں پہنچ کر ایسی ٹھوس اور جامد نظر آتی ہیں جیسا کہ دنیا والے ان کو دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں۔یہاں یہ یاد رکھنا بے حد ضروری ہے کہ یہ اشیاء جو یہاں نظر آتی ہیں وہ دیکھنے والے کے لیے پہلے بالکل معدوم یعنی اخفیٰ کی حالت میں ہوتی ہیں۔پھر رفتہ رفتہ ابھرتی اور موہوم سی نظر آتی ہیں (یہ ان کی خفی کی حالت ہے) پھر جب وہ اور زیادہ جلا پاتی ہیں تو رفتہ رفتہ پوری طرح مجلّی اور متجلّی ہو کر (روحانی آنکھ کو) نظر آنے لگتی ہیں۔اس سے جناب ابن عربی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ جو نور نظر آتا ہے یہی ذات احدیّت ہے اور کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب اسی ذات سے پیدا ہوتی ہیں اور اسفل کی طرف نزول کرتے کرتے آخر میں اس قدر کثیف ہو جاتی ہیں کہ مادی عالم میں پہنچ کر مادی کہلاتی ہیں اس طرح کے ظہور اشیاء کو حضرت ابن عربی نے تجلّی کا نام دیا اور در اصل یہی نام ہے بھی سب سے مناسب اور صحیح، کیونکہ تجلّی صرف روشن ہو جانے کو نہیں کہتے بلکہ جو چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں یا جو خیالات دماغ میں موہوم سے ہوتے ہیں وہ اگر صاف صاف دکھائی دینے لگیں یا سمجھ میں آ جائیں تو اس کو بھی جلا یا تجلّی کہتے ہیں

(مثلاً ایک بہت ہی باریک عبارت کوجلی قلم سے لکھ دینا) الغرض اس وجہ سے حضرت ابن عربیؒ نے وحدت الوجود کانظریہ قائم کیااور دعوٰی کردیا کہ وجود ایک ہے اور وہی خدا ہے، اور جواشیاء ہم کودکھائی دیتی یا محسوس ہوتی ہیں وہ سب اسی وجود کی تجلیات اور عین ہیں یعنی یہ سب کچھ مل کر ایک وجود ہے اور وہی خدا ہے اور یہ اسی طرح ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ناظرین سے التماس ہے کہ اس کتاب کے پانچویں باب میں ہم نے مادہ پرستوں اور وجودیوں کے اقوال کا جو مقابلہ کیا ہے ایک بار پھر اس کو دیکھ لیں۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ دونوں ایک ہی بات کہتے ہیں، صرف الفاظ کا الٹ پھیر ہے۔ اب ہم آپ کو یاد دلاتے ہیں کہ حضرت مجدّد الف ثانیؒ بھی بقول خود اسی مقام پر کچھ عرصہ مقیم اور حضرت ابن عربیؒ کی طرح وحدت الوجود کے قائل رہے لیکن جب اور اوپر چڑھے اور ھو کے اوپر والے کنارے کے قریب پہنچے تو وہ وحدت الوجود کے منکر ہو گئے اور یہ سمجھے کہ مخلوقات خدا کی ذات کا ظل (سایہ) ہے۔ وہ ایسا کیوں سمجھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک سالک ھو کے نیچے والے کنارے کے قریب رہتا ہے تو وہ اوپر سے آنے والی ارواح اور احکام خداوندی کو اپنے ہی اردگرد ابھرتا ہوا محسوس کرتا ہے اور یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ یہ سب چیزیں یہیں پیدا ہو کر نیچے کے عوالم کی طرف نزول کرتی ہیں جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔ حضرت ابن عربیؒ نے بھی یہی سمجھ لیا تھا، لیکن جب وہ ترقی کرتے اور اوپر کو اُٹھتے ہوئے ھو کے اُوپر والے کنارے کے قریب پہنچتے ہیں تو یہی ارواح اور احکام خداوندی اُن کو اوپر سے آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور چونکہ یہ سب شعاؤں کی شکل میں ہوتے ہیں اور اس کثرت اور تواتر سے نازل ہوتے ہیں جیسے کہ بارش یا سورج کی کرنیں اوپر سے گرتی ہیں۔ اب وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ سب مخلوقات ذات کا ظل یا سایہ ہے جیسے کہ دھوپ سورج کا سایہ یا ظل ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے سمجھ لیا کہ مخلوقات ذات باری تعالٰی کا سایہ ہے۔ یہاں قارئین کے دل میں یہ وسوسہ آنا چاہئے کہ جب ھو کے اوپر عدم کا عالم ہے تو یہ ارواح واحکام وغیرہ عدم میں معدوم ہو کر ھو میں داخل ہوتے ہی کس طرح متشکل ہو جاتے ہیں۔ یہ وسوسہ بالکل بجا ہے اور حق بھی یہی ہے۔ بات یہ ہے کہ عدم خود ایک طرح کا وجود ہے جس کا خاصہ تخریب وفنا ہے۔ یہ ارواح وغیرہ جب یہاں پہنچتی ہیں تو یہ خاصہ اپنی بساط کے مطابق

جذب کر لیتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں یعنی عدمیت کا وجود اختیار کر لیتی ہیں مگر جب ھو میں نزول کرتی ہیں تو پھر اپنا پہلا وجود اختیار کر لیتی ہیں ۔لیکن اب اس وجود میں عدمیت کا خاصہ شامل ہوتا ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ یہ ارواح وغیرہ اگر عدم میں سے نہ گزرتیں تو عالم مادی میں آ کر نہ ان میں کوئی خرابی پیدا ہوتی نہ ان کو موت آتی ۔غالب نے اسی بات کو یوں کہا ہے۔

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہ بات اس دریا کی مثال سے بھی کچھ کچھ متصور ہو سکتی ہے جو کھلے میدان میں بہتا ہوا کسی بڑے ریگستان میں داخل ہوتا اور کچھ دور جا کر غائب ہو جاتا ہے لیکن دس بیس میل کے بعد پھر ظاہر ہو جاتا ہے ۔ہم نے اس مشکل ترین حقیقت کو آسان ترین الفاظ میں بیان کرنے کی پوری کوشش کی ہے خدا جانے آپ کی سمجھ میں کچھ آیا ہے یا نہیں بہر حال جو سالک یہاں تک پہنچتے ہیں اگر انہوں نے ہماری یہ کتاب اور خاص کر یہ بیان پڑھ لیا ہے تو ان کو سلوک طے کرنے میں بڑی آسانی ہوگی اور وہ کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں گے۔ ھو سے آگے عدم اور اس سے آگے عالم امر ہے یعنی جو اشیاء یا ارواح عالم مادی میں پیدا ہونے والی ہیں ان سب کی مثالی صورتیں مع تمام جزئیات کے ابھی اللہ تعالیٰ کے ذہن میں ہیں اور نزول کر رہی ہیں ۔کوئی ولی، نبی یا فرشتہ ان کا حال نہیں جان سکتا۔ عالم امر کے آگے عرش اور عرش کے مرکز میں اللہ کی ذات احدیت ہے جب حضرت مجدّد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ اس مقام مقدس پر پہنچے تو اصل حقیقت ان کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اللہ، اللہ ہے اور مخلوق مخلوق ہے ۔یہ دو وجود ہیں ۔ایک وجود کا نظریہ یا عقیدہ غلط ہے اور وہ بے اختیار پکار اُٹھے **اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّار** (ترجمہ اللہ ہی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر لحاظ سے واحد ہے اور سب پر غالب ہے)

☆☆☆☆☆